OUR
TEACHER
OUR
HERO
مشرق
سنڈے میگزین
21 December 2014
طاہرہ قاضی شہید...
پرنسپل اے پی ایس ورسک روڈ
میڈم طاہرہ قاضی ۔ پرنسپل ۔ دہشتگردوں کے حملے کے وقت اپنے کمرے میں تھیں ۔ ان کے کمرے کے قریب پر ایک محفوظ پناہ گاہ بھی تھی ۔ میڈم قاضی پناہ گاہ میں جانے کے بجائے باہر نکلیں اور بچوں کو خوفزدہ ہو کر ادھر ادھر بھاگنے کی بجائے کمروں میں پناہ لینے کی ہدایات کرتی رہیں ایک کمرے سے دوسرے کی طرف بھاگتی رہیں انہوں نے ہمت اور بہادری سے حالات کا مقابلہ کیا ، واپس آ کر ٹیلیفون پر گھر اطلاع دے رہی تھیں ۔ اپنے بیٹے سے کہا فون بند کرو مجھے بچوں کے والدین کو اطلاع کرنی ہے دہشتگردوں نے انہیں یرغمال بنالیا ان کی لاش آپریشن ختم ہونے کے کئی گھنٹے کے بعد ملی ۔ اس کے ارد گرد دیسی ساختہ بموں کے ٹکڑے تھے ۔ حفصہ گل ، حفصہ گل لیکچرر ۔ رات کو والدہ سے کہا آنے کا ایک پیچ اپنا کر رکھنے صبح روزہ رکھا اور اسکول گئیں ۔ کمرے میں ٹیلیفون پر اطلاع دے رہی تھیں کہ گولیوں سے چھلنی کردی گئیں ۔ مسز بریگیڈیئر طارق کو زندہ جلادیا گیا ، مسز میجر جمشید کو ان کے دو بچوں سمیت شہید کیا گیا ، دیگر لیکچرر میں بابرہ فرحت ، شہناز نعیم ، سعدیہ گل ، صوفیہ ، مسز خان اور اسلامیات کے پروفیسر سعید کو گولیاں مار کر شہید کیا گیا یہ سب ہمارے ہیرو ہیں ۔

گناہ پہ گناہ

گندگی کے ڈھیروں پر سنگدلی سے پھینکے گئے بچوں کی دلخراش چیخوں کو ماں سنتی ہے نہ معاشرہ

فہیم آفریدی

روشنیوں کے شہر کراچی کی تنگ و تاریک گلیوں میں ایک خونی کھیل کھیلا جاتا ہے جہاں اپنے گناہ پر پردہ ڈالنے کے لئے یا غربت و افلاس کے ہاتھوں مجبور لوگ اکثر گندگی و غلاظت کے ڈھیر پر اپنے نوزائیدہ معصوم بچوں کو پھینک جاتے ہیں۔ کوڑے کرکٹ کے علاوہ اگر اس روتے بلکتے معصوم بچوں کی نرم و نازک جلد کو کسی لمس کا احساس ہوتا ہے تو وہ کسی آوارہ بلی یا کتے کا ہوتا ہے جو ان ڈھیروں میں اپنی خوراک ڈھونڈتے ہیں یہ چیلا ہے بھوکا ہے پیاسا ہے پیار ہے یا درد محسوس کر رہا ہے کوئی پریشان دہرنا ماں نہیں ہوتی جو اس کی دلخراش چیخوں پر اس کی جانب لپک سکے۔ جلد یا بدیر آخری ہچکی کے ساتھ ہی یہ ادھ کھلی کلی بن کھلے مرجھا جاتی ہے۔ اور پھر اکثر اس گندگی کے ڈھیر کو آگ لگا دی جاتی ہے اور یوں یہ آگ اور دھواں اس کی قبر بن جاتی ہے۔ فرق کچھ نہیں پڑتا یہ ایک عام سی بات بن گئی ہے جو ٹی وی پر ایک پٹی یا اخبار کے ایک کونے میں ایک چھوٹی سرخی یا خبر کے ساتھ نظروں سے گزر جاتی ہے۔ روز مرہ کا یہ معمول ہے جس کے اب تقریباً سبھی عادی ہو گئے ہیں۔ لیکن اگر کبھی کسی حکومتی ایجنسی یا دوسرے متعلقہ فرد سے یہ سوال پوچھا جائے کہ روز کتنے بچے ان تاریک گلیوں میں معاشرے کی بے حسی و سنگدلی کا نشانہ بنتے ہیں تو یقیناً جواب ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔ بے گھر افراد اور اس طرح کے بچوں کو تحفظ فراہم کرنے والے چیپا ویلفیئر ایسوسی ایشن نامی ادارہ چلانے والے رمضان چیپا کے بقول "ہم یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے یہ سینکڑوں ہو سکتے ہیں اور ہزاروں بھی بچوں کے عالمی ادارہ "یونیسیف" سے رجوع کیا جائے تو کہتے ہیں کہ ایدھی سے رابطہ کریں شاید ان کے پاس اعداد و شمار موجود ہوں۔ کراچی کی میونسپل کارپوریشن کے ذمہ داروں سے پوچھو تو بھی جواب ملتا ہے "ایدھی سے پوچھیں" لوگ عموماً انہیں ہی بلاتے ہیں "ہمیں نہیں" دوسری جانب ہزاروں بے گھر بچوں کو اپنے سایۂ عاطفت میں لینے والی اور محبت و عقیدت کی بنا پر "ماں" کہلائے جانے والی بلقیس ایدھی کہتی ہیں کہ کتنے بچے یوں لاوارث چھوڑ دیئے جاتے ہیں یہ ہمیں پتہ نہیں بسا اوقات لوگ اپنے گناہوں پر پردہ ڈالنے کے لئے بچے کی پیدائش کے فوری بعد ہی اسے کوڑے کے ڈھیر پر چپکے سے پھینک جاتے ہیں بعض اوقات کوئی جوڑا اس مقصد کے لئے کسی دایہ کی خدمات لے لیتا ہے جسے اس کام کی اجرت دی جاتی ہے۔ زندگی کے آغاز پر ہی موت کی ویلفیئر ایسوسی ایشن کے پاس اس طرح کا کوئی ڈیٹا دستیاب نہیں کہ کتنے بچے کوڑے کرکٹ سے اٹھائے اور کتنے بے اولاد جوڑے یا درد دل رکھنے والے شہری گود لے چکے ہیں دونوں بس تخمینی اعداد و شمار بتاتے ہیں۔ رمضان کے بقول ہر ماہ وہ درجنوں ایسے ہی اس طرح کے واقعات پیش آتے ہیں جن میں کبھی کبھار ہی کوئی بچہ سانس لے رہا ہوتا ہے۔ برآمد کئے گئے بچوں میں سے ہر سال زیادہ سے زیادہ چار زندہ ہوتے ہیں۔ بلقیس کے بقول لوگ رات کی تاریکی میں ان بچوں کو پھینک کے چلے جاتے ہیں جو قریب المرگ کی حالت

آغوش میں ابدی نیند سونے والے ان بے نام بچوں کی تعداد زیادہ تو بتائی جاتی ہے مگر حقیقی پیمانہ نہیں ہے۔ اس حوالے سے منظر عام پر آنی بعض نجی رپورٹوں کے مطابق اس بے رحمی اور سنگدلی کا نشانہ بننے والوں بچوں کی تعداد ہر سال سینکڑوں تک پہنچ جاتی ہے۔ تاہم سرکاری سطح پر معلوم اعداد و شمار کا ریکارڈ دستیاب نہیں ہے۔ یونیسیف کے پاس مصدقہ اعداد و شمار موجود نہیں تو ایدھی سنٹر اور چیپا میں صبح کوڑا کرکٹ جمع کرنے والے بچوں کے ہاتھ آتے ہیں ہمارے جھولوں پر واضح طور پر یہ پیغام درج ہوتا ہے کہ کوڑے کرکٹ میں اپنے بچوں کو نہ پھینکیں اس کی بجائے انہیں ان جھولوں میں چھوڑ جائیں آخر کار بیکار بچے کو بھی ہمارے ہاں زندہ بچ جانے کے امکانات ہوتے ہیں لیکن غلاظت میں گرائے جانے والے بچوں کی تقدیر میں تو اکثر موت ہی لکھی ہوتی ہے۔

ان کروڑ کی آبادی کے حامل اس ملک کی ہر حکومت اس حوالے سے عدم توجہی اور غیر فعالی کا مظاہرہ کرتی آئی ہے یہی وجہ ہے کہ اس خلاء کو ایدھی اور چیپا جیسے فلاحی ادارے ہی پر کرتے ہیں جو ہزاروں افراد کو چھت، خوراک اور دیگر ضروریات مہیا کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کرتے اور تو حکومتی سطح پر اس طرح کی افسوسناک موت مرنے والوں کے صحیح اعداد و شمار کے اندراج کا انتظام بھی موجود نہیں مرنے والے تو در کنار گھر سے فرار ہونے والے بچوں کی بھی صحیح تعداد کسی کو معلوم نہیں کی جا سکی جو بعض اوقات 1.5 ملین تو بعض اوقات دس ملین بتائی جاتی ہے۔ بعض ذرائع کے مطابق کوڑے کرکٹ میں پھینکے گئے سارے بچے ہی گناہ کی پیداوار نہیں ہوتے بلکہ اکثر شادی شدہ جوڑے بھی اپنی نوزائیدہ اولاد کو یوں بے یارو مددگار چھوڑ دیتے ہیں اور ظاہر ہے اولاد ہمیشہ پیاری ہوتی ہے۔ نرینہ اولاد کے پیدا نہ ہونے کا غم و غصہ یا پھر مایوسی انہیں یہ انتہائی اقدام اٹھانے پر مجبور کر دیتی ہے اکثر جوڑے غربت و افلاس کے باعث اپنے جگر گوشوں کو غلاظت کے ڈھیر پر چھوڑ جاتے ہیں بقول رمضان ان کے ادارے کو اکثر ایسے کال آتے ہیں کہ ان کے گھر کے باہر بچہ ملا ہے۔ ان کی یہ حالت آوارہ پھرنے والے جانور یا پرندوں کی ہوتی ہے جن کو کوئی گود لینا چاہے یا کوئی اپنی گود بھرنے کے خواہاں جوڑے صحت مند بچوں کو ہی ترجیح دیتے ہیں۔ رمضان چیپا کے بقول کوڑے کرکٹ سے ملنے والے کم ہی بچے شادی کا نتیجہ ہوتے ہیں اکثر شادی شدہ جوڑوں کے ہاں دوسری بار بچی کی پیدائش ہونے پر اس سے چھٹکارا پانے کی سوچی جاتی ہے۔ عرصہ 35 سال سے ایدھی میں کام کرنے والی زہرہ بی بی کے بقول کوڑے کرکٹ کے ڈھیر سے ملنے والے بچے اکثر مردہ پیدا ہوتی ہیں یہ ہمارا معاشرہ ہے جہاں کبھی شوہر نے اس لئے طلاق دی کہ میرے ہاں پانچ بچیوں کی ولادت ہوئی تھی میری ماں بھی پانچ بچیوں کی ماں تھی میں کہتی ہوں کہ بیٹی بھی خدا کی رحمت ہوتی ہے مگر بعض لوگ صرف بیٹے کی پیدائش پر مسرور ہوتے ہیں خواہ وہ دس لڑکی کیوں نہ ہو۔ جامعہ آغا خان کے شعبہ نفسیات کے ڈائریکٹر ڈاکٹر مراد کے بقول صرف کم آمدنی اور غریب جوڑے ہی ایسا نہیں کرتے بلکہ اکثر خوشحال گھرانوں میں بھی دوسری تیسری بیٹی قریبی رشتہ دار یا بہن یا گھرانے کے کسی دوسرے فرد کے حوالے کر دی جاتی ہے اس کی بڑی وجہ بیٹی کو بوجھ سمجھا جانا اس کی پرورش اس کی تربیت اور جہیز جو پرائے گھر چلے جانا ہوتی ہے جبکہ دوسری طرف لڑکے کو مضبوط بازو سمجھا ماں باپ کے سہارے گھر کی کفالت اور خاندان کے تسلسل کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ لیکن حکومتی سطح پر عوامی مہم کے بغیر کسی ماں کو مشکل ہی راضی کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی اولاد کو یوں رات کے اندھیرے میں خود سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا نہ کرے۔ بچوں کی فلاح و بہبود کی دستیابی اس کے فروغ میں حکومتی عدم دلچسپی کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا مشکل ہی ہے کہ کتنے بچے ترک اور کتنے بہاؤ پر موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔

لاہور کی بڑی مارکیٹ میں نو سالہ مجاہد اور آٹھ سالہ علی ابلے انڈے فروخت کرتے ہیں دونوں ایک غریب مزدور کے بیٹے ہیں صبح ایک نجی سکول جاتے تو آدھی رات گئے تک روزی روٹی کمانے کی سعی کرتے ہیں ان کا مقصد دو سو روپے کما کر ابو کے ہاتھ پر رکھنا ہوتا ہے۔ دس سالہ فیضان مال روڈ پر جہاں امیر گھرانے شاپنگ کے لئے آتے ہیں بچوں کی کتب فروخت کرتا ہے پچھلے سال اس نے سکول جانا چھوڑ دیا تھا 1999ء کا زمانہ ہوتا تو یہ بچے سو سے زائد بچوں کو اپنی درندگی کا نشانہ بنانے والے جاوید اقبال جیسے درندہ صفت لوگوں کے ہتھے آسانی سے چڑھ چکے ہوتے۔ بعض رپورٹوں کے مطابق اس وقت ملک بھر میں سٹریٹ چلڈرن کی تعداد 1.5 ملین ہے۔ درحقیقت پوش علاقوں کے اکثر خوشحال گھرانے ان بچوں سے غلاموں کی طرح کام لیتے ہیں۔

جب اپنے منہ موڑتے ہیں

وہ کراچی میں رہتی ہیں نرسنگ ان کا پیشہ ہے جس کے بے یارو مددگار لوگوں کی امانت کے لئے اس نے اپنی زندگی وقف کر رکھی ہے سندھ کے دور دراز گاؤں اور دیہات کا دورہ کرتی رہتی ہیں جہاں وہ شیر خوار بچوں کی غذائی ضروریات پوری کرنے کی سعی کرتی ہیں۔ بے شمار ایجنسیوں اور این جی اوز کے ساتھ کام کر چکی ہیں اپنا نرسنگ سنٹر بھی چلاتی ہیں لاتعداد ضرورتمندوں جن میں بوڑھے، جوان اور بچے سبھی شامل ہیں کی خدمت کر چکی ہیں اور شاید اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ خود ان میں سے ایک ہیں 67 سال کی اس معمر خاتون کا نام لیلیٰ ہے۔ ان کی کہانی 1947ء میں تب شروع ہوتی ہے جب حیدرآباد کے لیڈی ڈفرن ہسپتال کے شعبہ نرسنگ کی ڈائریکٹر میری مارین سین اپنے معمول کی ڈیوٹی پر تھیں۔ تب انہیں ہسپتال کے عملہ کی ایک عورت ملی بچی بارے بتایا جس نے آدھی رات کو ایک ننھی سی بچی کو سبز رنگ کے کپڑے میں لپیٹ کر ہسپتال کے باہر چھوڑ دیا تھا۔ مسز سین اس بچی کو گود لینے کا فیصلہ کیا جس کو انہوں نے لیلیٰ نام رکھا۔ دو سال بعد مسز سین کے ہاں ایک بچی لیلیٰ کی ولادت ہوئی اپنے شوہر اور دو بیٹیوں کے ساتھ جن کی پرورش اور محبت و شفقت میں وہ کسی طرح کا امتیاز یا فرق روا نہ رکھتی تھیں۔ عرصہ بعد انہوں نے اپنے دونوں بیٹیوں کے نام ایک مکان تعمیر کیا مکان کی خریداری کے لئے منعقدہ ایک تقریب میں پادری نے یہ انکشاف کیا کہ مسز سین کی حقیقی بیٹی کون ہے؟ ایک بچی میں کوئی امتیاز نہیں کرتی تھیں مگر یہ حقیقت جاننے کے بعد وہ دونوں لڑکیوں کے بیچ انجانا احساس پیدا ہو گیا۔ لیلیٰ کی پیدائش کے بارے میں جان کر بہن نے اس راز سے پردہ اٹھایا جو اپنی اصلیت جاننے کے بعد لیلیٰ پر کیا گزری اس کے قطع نظر مسز اور مسٹر سین کی بعد کی زندگی 1995ء میں وفات کے وقت تک ان کا خاندان اسی طرح ہنسی خوشی کے زندگی گزار رہا۔ وفات سے قبل مسز سین نے دونوں بیٹیوں کے نام وصیت چھوڑ رکھی تھی (جو بعد میں انہیں کیا گیا تھا) اس کے مطابق لیلیٰ نے وہ گھر اپنی بہن کے نام کر دیا وہاں حیدرآباد گئیں جو نئی اور بہتر زندگی گزارنے کی کوشش کی۔ اس عورت نے تیتے ہوئے گھر کا دروازہ بند کیا اور چلا گیا کراچی کے قبرستان میں ہے جا کر اس کے ساتھ وہاں رہنے لگیں جو اس کی پیاری بہن جس کے تکرار سے وہ ساری عمر اتفاق رہی تھی جو ان کی طرح بہت پیار کرتی تھی نے بھی آنکھیں موڑ لیں تب سے لیلیٰ کا اعتماد اور بھروسہ رشتوں پر سے اٹھ گیا دوسرے بقول ان کے اپنی بہن کی جگہ کسی طرح کا ذکر کرنے والے شوہر اور اپنے بچوں کو اپنے بارے میں کیا بتاتی کہ ایسی بہن تھی کہ انہوں نے ساری زندگی شادی نہیں کی اور اپنے غریبوں کو "اپنے والدین کے دھتکارے اور اسی طرح معاشرے کے ٹھکرائے ہوؤں کی امانت اور فلاح و بہبود کے لئے وقف کر دیا"۔ لیلیٰ کی اس طرح کے بچوں کو گود لینے والوں سے بس یہی گزارش ہے کہ ایک مرتبہ جب آپ انہیں اپنا لیتے ہیں تو پھر ان سے نظریں کبھی مت چرائیں انہیں نظر انداز کریں اور ان کے ساتھ ترک تعلق نہ کریں ان کی دوسری بڑی خواہش اپنی ماں (مسز سین) کی آغوش ہے وہ خود اس کے لئے انہیں بے شمار مرتبہ اپنی موت کو گلے لگانا پڑا ہے۔

سادھو اور بدھو

بھارت میں خود ساختہ بھگوانوں کے کارناموں سے شیطان بھی شرماتا ہے

میگزین ڈیسک

آج کل ہندوستان میں ایک کے بعد دوسرا سادھو بابا سکینڈل سامنے آرہا ہے یہ بابے نہ صرف مال بنانے کے لئے روحانیت کا ڈھونگ رچاتے ہیں بلکہ اپنی ناآسودہ خواہشات کی تکمیل کے لئے اپنے پاس آنے والی خواتین کو گناہ کی زندگی پر راغب بھی کرتے ہیں۔ چار سال قبل جب ایک سادھو سوامی نتھیا نندا کی بے ہودہ جنسی زندگی کی تفصیلات سامنے آئیں تو اس کے بعد ان سادھوؤں کو بے نقاب کرنے کا ایک سلسلہ چل پڑا۔ 2012ء میں آشرام باپو کا سکینڈل سامنے آیا جنہیں ہندو دیوتا کہلاتے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے ایک اور سادھو نارائن سائیں کو بے نقاب کیا۔ بین الاقوامی شہرت یافتہ گرو راج نیش کی باری آئی سوامی روی شنکر بے نقاب ہوئے دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ سادھو بابا روحانیت کا ڈھونگ رچاتے ہوئے بین الاقوامی اداروں سے غریبوں کی امداد کے نام پر بھی بھاری رقومات سمیٹتے ہیں۔

خود ساختہ مذہبی پیشواؤں میں شامل سنت رام پال (انجینئر) تازہ ترین بے نقاب ہونے والے سادھو ہیں جنہیں ہزاروں چیلوں کی خاگی سیکورٹی عملے کی شدید مخالفت کے باوجود پولیس نے اس کے آشرم سے گرفتار کر لیا۔ یہ الگ بات ہے کہ رام پال کی گرفتاری کے لئے 12 دن سے زائد عرصہ تک پولیس کو انتظار کرنا پڑا اور ہریانہ کے ڈائریکٹر جنرل آف پولیس کے مطابق آشرم میں موجود خواتین اور معصوم بچوں کی حفاظت کی خاطر پولیس کو سخت رویہ اپنائے بغیر حتمی فائرنگ کے بغیر کارروائی انجام دینی تھی کیونکہ رام پال کے چیلے اور اس کی خاگی فورس معصوم شیر خوار بچوں اور خواتین کو ڈھال بنائے ہوئے تھی۔ رام پال کی گرفتاری کے لئے آشرم کے ارد گرد 45 ہزار پولیس اور سیکورٹی اہلکار موجود تھے اور آشرم کی تقریباً بیس میٹر طویل دیوار کو منہدم کر کے اس کی گرفتاری عمل میں لائی گئی۔ رام پال کی گرفتاری سے قبل وہاں پر موجود صحافی برادری بھی پولیس ظلم کا شکار ہوئی جب آشرم میں موجود رام پال کے سیکورٹی عملے نے اندر سے پتھراؤ کیا اور پھر فائرنگ بھی کی جس میں کافی تعداد میں پولیس جوان اور سیکورٹی اہلکار زخمی ہوئے۔ اس موقع پر اگر پولیس بھی فائرنگ کرتی تو کئی معصوم بچے اور خواتین جنہیں رام پال کے حامیوں نے ڈھال بنایا ہوا تھا ہلاک ہو سکتے تھے۔ اس کے باوجود پانچ خواتین اور ایک بچہ رام پال کے آشرم سے ہلاک شدہ دستیاب ہوئے ہیں ان خواتین اور بچہ کی موت کس لئے ہوئی اس کی تحقیقات جاری ہیں کیونکہ رام پال کے آشرم سے کئی ایسی چیزیں برآمد ہوئی ہیں جو پولیس اور سیکورٹی ایجنسیوں کو چونکا دینے والی تھیں۔ اب اگر رام پال کے خلاف لگائے گئے الزامات ثابت ہو جاتے ہیں تو اسے پھانسی کی سزا بھی ہو سکتی ہے۔

ہندوستان میں ایسے کئی خود ساختہ بھگوان بنے بیٹھے ہیں جن کے درشن کرنے بڑے بڑے سیاسی سماجی قائدین اپنی خوش قسمتی سمجھتے ہیں اور ان کے اشاروں پر وہ اپنی حکومت کی نیا چلانا چاہتے ہیں لیکن ایک نہ ایک دن ایسے خود ساختہ باباؤں' بھگوانوں کا پردہ فاش ہو جاتا ہے تو شرمندگی کی وجہ سے یہی سیاسی' سماجی قائدین منہ چھپاتے پھرتے ہیں۔

ماضی اور حال میں خود ساختہ باباؤں اور بھگوانوں کو الزامات کے تحت گرفتار کرنے اور الزامات ثابت ہونے پر جرائم کے تحت فیصلے سنائے گئے ہیں۔ اب بھی ہندوستان بھر میں ایسے کئی خود ساختہ بابا اور بھگوان بنے بیٹھے ہیں جو کروڑوں روپے کی ہیرا پھیری کرتے ہیں ان کی زندگی جس عیش و عشرت میں گزر رہی ہے اس کا اندازہ کرنا محال ہے۔ اگر ان خود ساختہ باباؤں اور بھگوانوں سے ملاقات کرنی ہو تو ان سے پہلے ہی اجازت لینی پڑتی ہے اور یہ اجازت بھی مفت میں نہیں بلکہ ان کی جانب سے مختص کی گئی فیس ادا کرنے کے بعد ہوتی ہے آج کل الیکٹرانک میڈیا کے ذریعہ خود ساختہ باباؤں اور بھگوانوں کی تشہیری مہم بڑے پیمانے پر جاری ہیں۔ جس طرح رام پال کے آشرم میں کم و بیش 30 ہزار چیلوں و خاگی فوج ہتھیار وغیرہ کے پائے جانے کی رپورٹ آئی ہے اسی طرح دوسرے باباؤں و بھگوانوں کے پاس بھی خاگی سیکورٹی گارڈ اور ہتھیار موجود ہوں گے جو تربیت یافتہ ہوں گے اور یہ کسی بھی وقت بھارت کے لئے خطرہ ثابت ہو سکتے ہیں جس طرح کے واقعہ بابا رام پال کے آشرم میں پیش آیا اگر پولیس مصلحت پسندی سے کام نہ لیتی اور آشرم کی دیوار کو منہدم کرنے کے بجائے فائرنگ کر دیتی اور آشرم کے اوپر سے حفاظتی کارروائی انجام دی جاتی تو شاید ایک بہت بڑا سانحہ پیش آتا لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس آشرم کی جگہ کسی مسلمان نام نہاد بابا یا صوفی کی خانقاہ یا مدرسہ ہوتا تو شاید پولیس اتنی مصلحت پسندی سے کام نہ لیتی؟ گزشتہ دنوں بعض ہندو تنظیموں کی جانب سے مدارس میں غیر قانونی سرگرمیوں اور "لو جہاد" کے نام پر مسلمانوں کو مورد الزام ٹھہرایا گیا تھا لیکن جب حقیقت آشکار ہوگئی تو یہی ہندو متعصب پرست فرقہ پرست ذہنیت کے قائدین و کارکنوں کی زبانیں بند ہوگئیں۔ یوں تو مدارس اسلامیہ کو ہندو متعصب پرست دہشت گردی کے اڈے قرار دینے کی کوشش کرتے رہے ہیں لیکن تحقیقات کے بعد پولیس یا خفیہ ایجنسیوں کو ان مدارس میں ملک کے خلاف کسی قسم کی سرگرمی یا دہشت گردی میں ملوث ہونے کا ثبوت فراہم نہ ہو سکا البتہ ان مدارس کے طلباء علماء پر جھوٹے الزامات عائد کر کے گرفتار کیا گیا اور بعد گرفتاری ان میں سے کئی بے قصور ثابت ہوئے۔ ہندوستانی دینی مدارس میں تو غیر قانونی سرگرمیاں ثابت نہ ہو سکیں لیکن ان خود ساختہ باباؤں اور بھگوانوں کے آشرموں میں عصمت ریزی' خواتین سے دست درازی' قتل و غارت گری' غیر قانونی طور پر جمع شدہ ہتھیار' بے دریغ دولت' آشرموں میں خفیہ کیمروں کے ذریعہ خواتین کی ویڈیو گرافی اور پھر بلیک میلنگ' بیمار لڑکیوں کو آسیب زدہ قرار دے کر ان کا جنسی استحصال جیسے واقعات منظر عام پر آتے رہے ہیں۔

ضلع حصار کے برولا علاقہ کے آشرم کا سنت رام پال جس نے ہندوستانی عدلیہ کا حکم نہ مان کر اپنے چیلوں و خاگی فوج کے بھروسے پر عدلیہ کو نظر انداز کرکے اور پولیس و سیکورٹی ایجنسی کے اہلکاروں پر فائرنگ اور پتھراؤ' آشرم میں ہتھیاروں کی موجودگی جیسے جرم کا ارتکاب کیا ہے اس کے خلاف عدلیہ کی توہین ملک سے بغاوت جیسی کئی دفعات کے تحت مقدمہ درج ہوا ہے۔ الزام ثابت ہونے کی صورت میں اسے پھانسی کی سزا بھی ہو سکتی ہے۔ رام پال جیسے اور خود ساختہ باباؤں سادھوؤں نے ملک میں اپنی جنسی پیاس بجھانے کے علاوہ فرقہ پرستی کا زہر گھولنے میں اہم رول ادا کیا ہے اور کر رہے ہیں ان باباؤں اور سادھوؤں و بھگوانوں میں دھیریندر برہماچاری جو آنجہانی اندرا گاندھی کے لئے ملک کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو نے "یوگ گرو" کے طور پر رکھا تھا۔ اس گرو کے پاس اتنی دولت تھی کہ وہ اپنے خاگی ہیلی کاپٹر سے سفر کیا کرتا تھا۔ 1994ء میں یہ ہیلی کاپٹر حادثہ میں ہلاک ہو گیا چندرا سوامی جو سابق وزیر اعظم وی پی نرسمہا راؤ کا روحانی گرو تھا اس کے خلاف اسرائیل کی خفیہ ایجنسی موساد اور سری لنکا کے علیحدگی پسند گروپ ایل ٹی ٹی ای وغیرہ کے علاوہ دنیا کے کئی ممالک کی بااثر شخصیات سے اس کے مراسم تھے اس پر مالی خرد برد کرنے کا الزام تھا۔ سی بی آئی اور سپریم کورٹ میں اس کے خلاف کئی معاملے چلے۔ اسی طرح ستیہ سائیں بابا' یوگ گرو بابا رام دیو' آسا رام باپو' نرمل بابا' نتیا نند سوامی وغیرہ جیسے نام منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ان باباؤں اور سادھوؤں کے آشرموں کا جائزہ لیا جائے تو ان کے کالے کرتوتوں کا پردہ فاش ہو جاتا ہے۔ ان باباؤں اور سادھوؤں کی تشہیر کرنے والا اصل ذریعہ الیکٹرانک میڈیا ہے کئی الیکٹرانک میڈیا چینلز پر روزانہ گھنٹوں ان کی تشہیر کی جاتی ہے۔ آج مسلمانوں کے دینی مدارس سے نہیں بلکہ ہندوؤں کے آشرموں سے بھارت کو خطرہ ہے۔

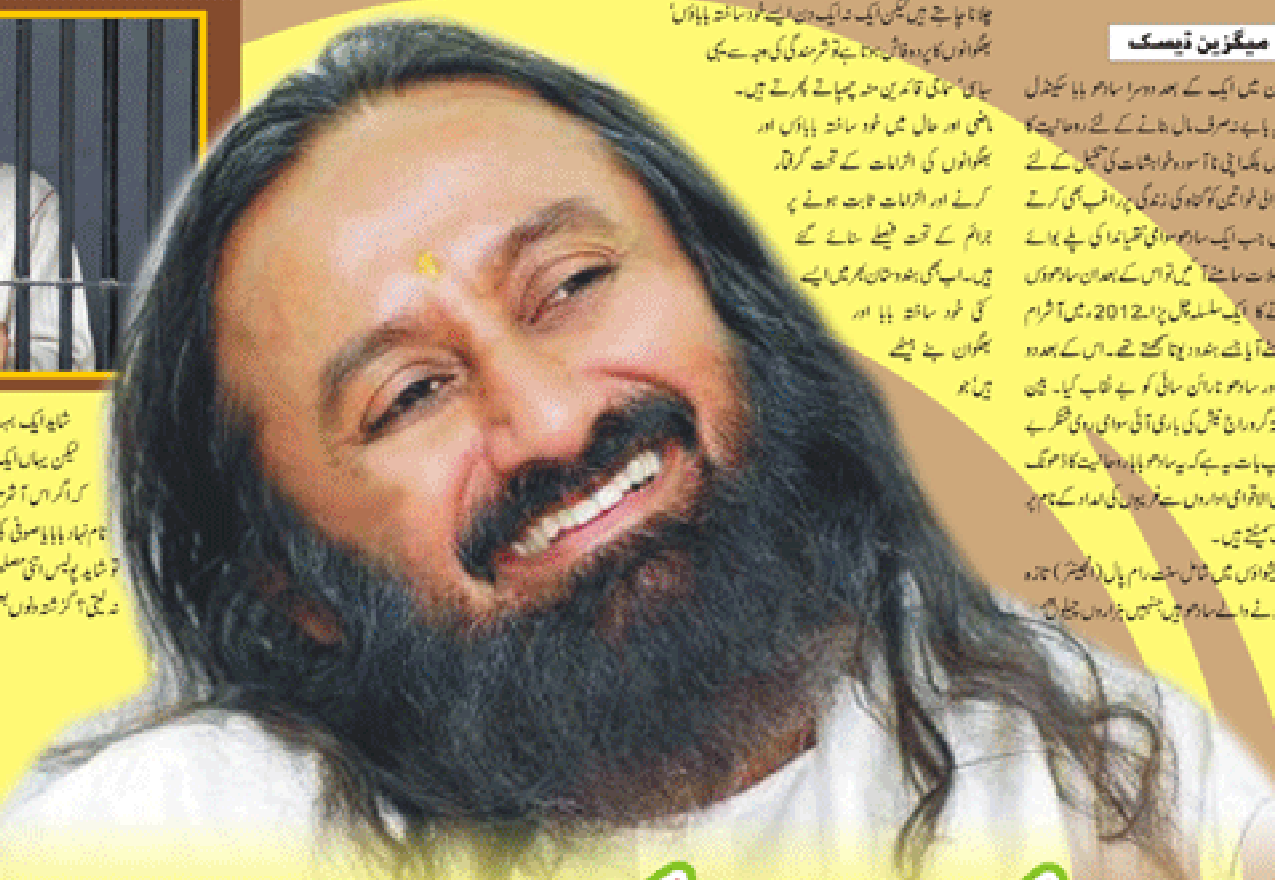

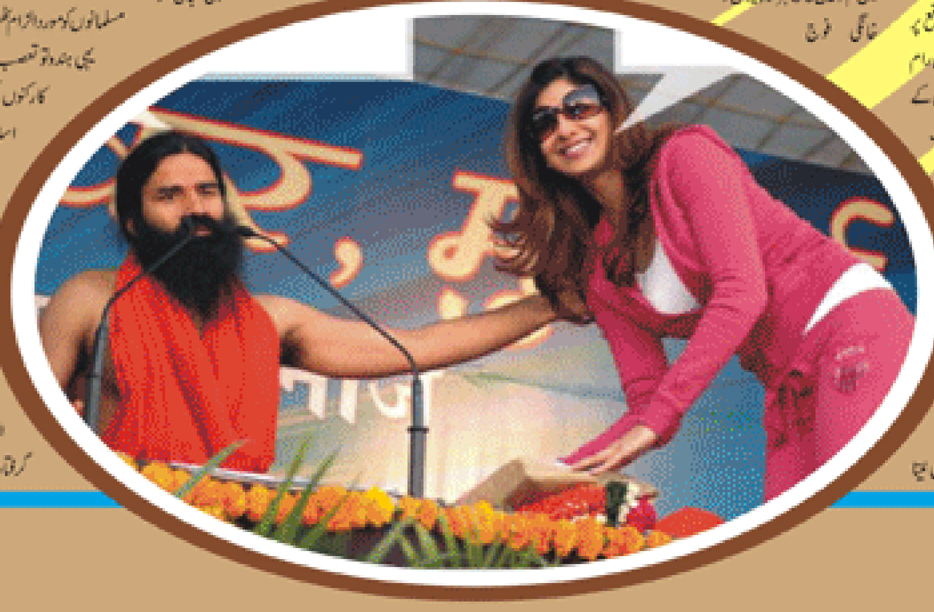

1999-2000ء سکول میں منعقدہ یوم والدین کی تقریب کی ایک یادگار تصویر

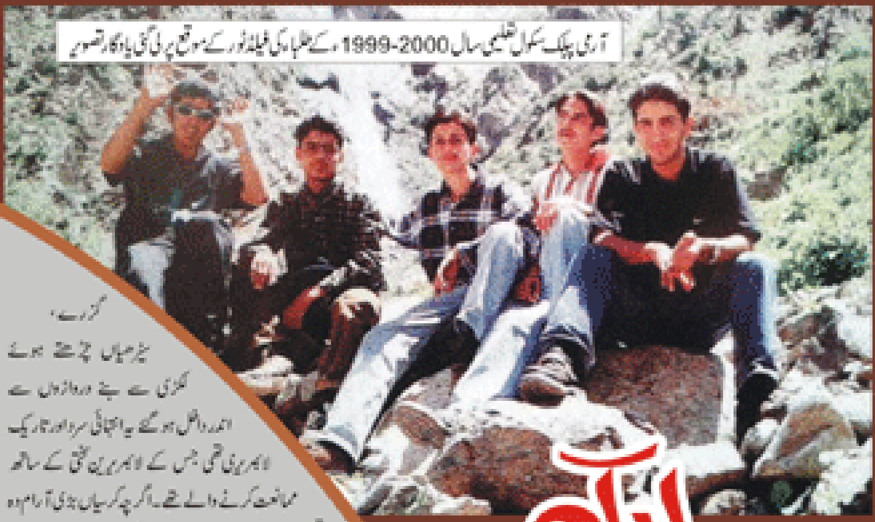
آرمی پبلک سکول تعلیمی سال 2000-1999ء کے طلباء کی فیلڈ ٹور کے موقع پر لی گئی یادگار تصویر

ایک دفعہ کا ذکر ہے

آرمی پبلک سکول کی ساتویں جماعت کے کمرہ میں بیٹھے ایک سابق طالب علم کی یادیں اور نونہالی باتیں

اسد لیاقت

آپ جب سکول کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہیں تو ایک لمبی سیدھی سڑک آپ کے سامنے ہوتی ہے جس کے دائیں طرف کھیل کا میدان اور بائیں جانب سکول کی دیوار ہے تیرہ سال بعد شاید اب یہ اتنی طویل دکھائی نہیں دے گی۔ میری یادوں کے نہاں خانوں میں سڑک کی لمبائی اتنی ہی ہے تاہم میں اس پر پڑی تہہ در تہہ چھوٹی نقشوں کے ظہور یاد کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لائبریری کا پیریڈ تھا۔ 7 اے جماعت کے طلباء ایک قطار بنائے راہداری سے لگے آڈیٹوریم کے پاس سے گزرے، سیڑھیاں چڑھتے ہوئے لکڑی سے بنے دروازوں سے اندر داخل ہوگئے یہ انتہائی سرد اور تاریک لائبریری تھی جس کے لائبریرین کچھ کے ساتھ مماثلت کرنے والے تھے۔ اگرچہ کرسیاں بڑی آرام دہ تھیں ان میں سے ایک پر میں بیٹھ کر ایک کتاب پڑھنے لگا جس کا نام مجھے یاد نہیں آرہا یہ دشمن کے علاقے میں پھنسے ایک سپاہی کی کہانی تھی جو وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ سپاہی کی کہانی تھی جو وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا سخت سردی تھی لیکن وہ کسی سے پوچھ کا بھی نہیں کر سکتا تھا جانے اس کے جب اسے تھکن محسوس ہوتی تو وہ زمین پر لیٹ جاتا اور خود کو یہ باور کراتا کہ یہ گرم ہے یہ جبر یہاں کے کام آیا بھی تھی کہ اس جان لیوا سردی سے بھی خود کو یہ باور کرانے کے لئے کہ گرمی ہے (سردی نہیں ہے) اور یہ کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا وہ اپنی دماغی طاقت کو بروئے کار لاسکتا تھا تیرہ سال بعد اسی کرسی پر کوئی بچہ بیٹھ کر خود کو یہ باور کرانے کا خواہاں ہوگا کہ اس پر حملہ آور ہونے والے کے بچے میں سرد مہری گرمجوشی میں بدل جائے گی۔ شاید گولی لگنے کے بعد اس نے یہ کہا ہو کہ یہ اپنی ماں کی گرم آغوش کو یاد کرنے میں گزار رہے ہوں گے۔ جب میں وہ کتاب پڑھ رہا تھا تو مجھے یاد ہے کہ میرے لئے یہ ماننا مشکل تھا کہ ہم اپنی دماغی طاقت کو اپنے سامنے پڑے ترسے حقائق کو نظرانداز کرنے کے لئے استعمال کر سکتے ہیں آج مجھے کھٹکا رہی ہے کہ کس طرح یہ ممکن ہے اور کس طرح سے ہم سب اتنے عرصے سے یہی کرتے آرہے ہیں۔ ہم اس بے رحم (سرد مہری پچھی) اور مستقل دہشت گردی کے باوجود یادوز گرمجوشی کا اظہار کرتے رہے ہیں وہ کہتے ہیں کہ حملہ آور سکول اور اس سے متصل قبرستان کو علیحدہ کرتی دیوار پھلانگ کر داخل ہوئے تھے۔ سکول سے گھر واپسی پر میں اس قبرستان کے پاس سے گزرتا تھا اس کے سوا کوئی اور چارہ کوئی اور راستہ ہی نہیں تھا مجھے اپنی حیرت یاد ہے کہ کسی ایسے شخص کی طرح جس کا کوئی پیارا یہاں دفن ہو اس قبرستان آتا کس طرح لگتا ہوگا اس قبرستان میں زیادہ خالی جگہ مجھے یاد نہیں آتی تیرہ سال شہری آبادی میں تب سے اضافہ ہو رہا ہے کیا وہاں نعشوں کے لئے کافی جگہ ہوگی چھوٹی بڑی لاشوں کے لئے؟ کیا انہیں جگہ کی کمی کا سامنا کرنا پڑے گا؟

سکول کے اختتام پر کار پارک کی طرف جاتے انتظامی بلاک کے سامنے سے گزرتے ہوئے مجھے بعض اساتذہ اور بعض طلباء چھٹے سکول بلاک کے سامنے چمن میں مصلے بچھائے نماز پڑھتے دکھائی دیتے تھے یہ دس سے پندرہ لوگ ہوتے تھے اور عموماً میرے اسلامیات کے استاد ان میں سے ایک ہوتے تھے ان کا سر ہمیشہ بائیں جانب ہلکا سا جھکا ہوتا تھا۔ ان کے لئے شاید یہ نماز میں یکسوئی اور خشوع وخضوع کی علامت ہوتی تھی۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ کیا اب بھی وہاں پڑھاتے تھے کیا اب بھی ان کا سر دوران نماز بائیں طرف جھکا ہوتا ہے کیا یہ جھکاؤ ان کی جان آج بچا گیا ہے۔ سوچتا ہوں کیا ایک جھکاؤ کی کمی مصلوں پر بیٹھے دیگر کی جانیں لے چکی ہے۔

کلاس 7 اے کی کھڑکیوں سے ہمیں سکول کے احاطے کے اندر بے تحاشا درخت اور جھاڑیاں نظر آتی تھیں کبھی کبھار کلاس سے بچنے کے لئے اور کبھی بریک کے دوران ہم سکول کی عقبی دیوار کے ساتھ آگے ان درختوں اور جھاڑیوں جنہیں ہم جنگل سمجھتے تھے نکل جاتے تھے ہم ہنسی مذاق کرتے اور دوسروں کی چھوڑی ہوئی دلچسپ چیزیں ڈھونڈتے ایسے کہ ہم کسی جنگل کی صفائی کررہے ہوں۔ ایسے میں سٹاف کے کسی رکن کو نظر آجاتے تو ہمیں واپس کلاس میں بلا لیا جاتا۔ کیا ان بچوں میں سے کوئی ایک چھپنے کے لئے ان درختوں کی طرف بھاگا تھا؟ کبھی کبھار وہ ان درختوں اور جھاڑیوں کی کٹائی کی

1999-2000ء سپورٹس ڈے کے موقع پر ایک طالبعلم اپنے کرتب کا مظاہرہ کرتے ہوئے

لیتے تھے لیکن اگر انہوں نے ابھی یہ کام نہیں کیا تھا تو وہاں شاید چھپنے کے لئے جگہ تھی۔ لیکن ان کے ہیولوں کا سبز رنگ بہت تیز ہوتا ہے تو شاید کالے بوٹوں والوں نے انہیں وہاں چھپنے کی کوشش کرتے دیکھ لیا ہوتا ہم بعض اوقات سردیوں کے مہینوں میں دھند بھی ہوتی تھی آج سے کئی ماہ بعد جب کوئی اور بچہ دوسروں کی چھوڑی ہوئی دلچسپ چیزوں کی تلاش میں ان درختوں کی طرف جائے گا تو کیا اسے ٹیسٹ شارپنر ملے گا۔ چبائی ہوئی پنسل ہاتھ آئے گی۔ اسے چاکلیٹ کا بٹن ملے گا جسے کلاس میں کھانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی کیا ان چیزوں پر خون کے دھبے رہے ہوں گے؟ خون کے ان دھبوں کو صاف کرنے کے لئے کتنا خیال رکھا جائے گا؟

سکول کے بالمقابل ایک چھوٹی سی نہر ہوتی تھی جو مین روڈ کے متوازی بہتی تھی۔ جتنا یاد ہے ایک عرصہ ہوتا تھا جب ہمیں نہر کے دونوں اطراف گھٹنوں تک کیچڑ میں دھنسے سپاہی نہر کی صفائی کرتے دکھائی دیتے تھے وہ اسے بھل صفائی کہا کرتے تھے مجھے یاد ہے میں سوچتا تھا کہ غم کی حد کیا ہوتی ہے؟ کیا یہ فوری شروع ہو جاتا ہے یا صدمے کے گزرنے اور اس کی جگہ غم کے لینے میں وقت لگتا ہے شاید بعض لوگوں کے یہ پہلے اور بعض کے لئے بعد میں شروع ہوتا ہے یا شاید اکثریت کے لئے یہ کبھی واقع ہی نہیں ہوتا ہے کیونکہ غم کی حدیں بالکل مبہم ہوتی ہیں۔ انسانیت بحثیت مجموعی کبھی ختم نہیں ہوتی "بچوں کے پیچھے بہت سے بچے ہیں جاؤ اور انہیں مار ڈالو" ان میں سے ایک چلایا کیا کالے بوٹوں والا اس پر بھی افسردہ ہوگا؟ ہم افسردہ، غمزدہ کس لئے ہوتے ہیں؟ اموات؟ بچوں کی اموات کے لئے؟ کونسے عدد پر غم یہ افسردگی شروع ہوتی ہے؟ ان کے بقول 141 شہید ہوئے ہیں جن میں سے 132 بچے ہیں آخری مرتبہ آپ کب غمزدہ ہوئے تھے؟ اب عدد کیا تھا؟ کیا غم زدہ ہونے کے لئے اعداد سے زیادہ کی ہمیں ضرورت ہوتی ہے؟ تصاویر کی؟ کس طرح یہ سب ہوا اس کی تفصیلات کیا ہے؟ پچھلے چند سالوں سے لاشوں کا ڈھیر دکھائی دے رہا ہے جبکہ ہم سے ہزاروں لوگ جن میں ہم نے ان کا کوئی ماتم نہیں کیا۔ دنیا نے ان کا اس سے بھی کم ماتم کیا کونسا ظلم بڑا ہے؟ وہ لاکھوں جو ماتم کرتے ہیں؟ وہ اربوں جو کبھی ماتم نہیں کریں گے ہر مرتبہ ماتم کرنا ممکن نہیں ہے ہر ایک کا زیادہ عرصہ تک ماتم کرنا بھی ناممکن ہے۔

الزام اور مذمت

بڑے کالے بوٹوں والے نے کہا کہ اس نے کیا کیونکہ کالے بوٹوں والے دوسروں نے اس کے ساتھ ایسا کیا تھا اس الزام کے بانٹنے کے لئے تاریخ میں پیچھے کتنی دور ہم جاتے ہیں اور اپنا جال کتنا وسیع پھینک سکتے ہیں؟ ہم جانتے ہیں کہ اگر ہم اسے مکمل کر کے پیچھے ہیں تو یہ ہمیں گھیر لے گا یا انہیں جو ہمارے قریب ہیں اور یا انہیں جن کے ساتھ اختلاف رکھتے ہم دکھائی نہیں دینا چاہتے اور بس جو اور اگر کے درمیان راستہ ڈھونڈنے کی کوشش میں ہم ایک وقت میں ایک واقعہ لیتے ہوئے بڑے احتیاط سے شروع کرتے ہیں۔ جب ہم کسی ایک واقعے سے آگے جاتے ہیں تو ہم بڑے صاف ستھرے اور آرام دہ کہانیاں بیان کر سکتے ہیں۔ افغانستان پر روسی حملہ، امریکہ کا مجاہدین کو فنڈنگ کرنا، افغانستان اور کشمیر میں آرمی کی گیم، بھارتی دراندازوں، سعودی پیسہ، غربت، ناخواندگی، پسماندگی، منگل یا ستان یہ جس متوسط طبقے اگر یہ تخ کا باعث ہے اور یہ تخ کا کیا ہم تخ کا الزام تخ کو دے سکتے ہیں یا صرف یہ کوئی مورد الزام ٹھہراتا ہے؟ کہاں سے ہم شروع اور کہاں ختم کرتے ہیں؟ شاید طریقیں اس لئے پیدا ہوتی ہے کیونکہ ہمیں برائی کی تصویر کی ضرورت ہوتی ہے جس کا احاطہ ہمارے دماغ نہیں کر سکتے طریقیں کارآمد ہوتی ہیں کیونکہ یہ الزام کو ہم سے دور لے جاتی ہیں طریقیں سادہ، صاف اور خوفناک ہوتی ہیں شاید کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ برائی کارآمد ہوتی ہے کیونکہ اگر برائی چل جاتی ہے تو اچھائی بھی چل جاتی ہے اور ہم بھلائی کا جسم ہوتے ہیں کیونکہ ہم برائی کو بیان کرتے ہیں۔

ہر طرف سے مذمتیں کی جا رہی ہیں چیف آف آرمی سٹاف جنرل راحیل شریف، چیئرمین پی ٹی آئی عمران خان، وزیر اعظم نواز شریف، وزیر اعظم نریندر مودی، وزیر اعظم ڈیوڈ کیمرون، سفیر رچرڈ اولسن، صدر اوباما، سیکرٹری جنرل بان کی مون ہر کوئی اچھائی اور برائی اور دشمنی کی فطرت کے اپنے خیال کے ساتھ ہر کوئی الزام کے دائرے سے باہر، ماتم کے دائرے کے اندر آرمی چیف کہتے ہیں "ہمارے عزم میں بلندی آئی ہے ان کے آخری خاتمے تک ہم ان غیر انسانی وحشیوں اور ان کے سہولت کاروں کا پیچھا جاری رکھیں گے"۔ یہ حیوان کون ہے؟ کہاں اور کب یہ شروع ہوتا ہے اور اسے ختم کرنے کے لئے ہمیں کہاں جانے کی ضرورت ہوتی ہے؟ کیا یہ ہمارے سرحدوں کے اندر ہوتا ہے یا اس سے باہر بھی؟ کیا یہ وہاں ختم ہوتا ہے جہاں ہم شروع ہوتے ہیں یا یہ ہماری ارواح میں بھی سرایت کرتا ہے؟ بالآخر اپنی طرف مڑنے سے قبل کیا الزام دھرنے کے لئے کوئی اور باقی بچا ہے؟

ماتم، وزیر اعلیٰ خیبر پختونخوا نے تین روزہ سوگ کا اعلان کیا

اب ہم تین دن کے لئے سوگ منائیں گے اور پھر ہم سوگ منانا بند کر دیں گے ہم اپنے 9/11 بھول جاتے ہیں (کتنے زیادہ ہیں) دوسروں سے یاد رکھنے کی توقع ہم کس طرح رکھ سکتے ہیں؟

1999-2000ء مقابلہ نعت خوانی میں ایک بچہ پیارے نبیؐ کے ساتھ اپنی عقیدت پیش کرتے ہوئے

1999-2000ء کے تعلیمی سال کے دوران طلبہ سکول کی لائبریری میں محو مطالعہ

اپنی جان سے بے پروا جان بچانے والے
ریسکیو اہلکار گولیوں کی بوچھاڑ میں فرائض سرانجام دیتے رہے

میگزین ڈیسک

پشاور سکول حملے میں جس وقت دہشت گردوں اور کمانڈوز کی لڑائی جاری تھی تو ریسکیو اہلکاروں نے بھی جان کی پروا کئے بغیر زخمیوں اور معصوم جانوں کو بچانے میں اہم کردار ادا کیا ہے جس کے لئے وہ تحسین کے مستحق ہیں۔ ریسکیو 1122 کا ایک اہلکار جو کہ اس سانحہ میں اپنے فرائض کی انجام دہی میں شریک تھا کا کہنا ہے کہ آپریشن کے دوران کمانڈوز ہماری حفاظت کی خاطر ہمیں بار بار دور رہنے کا کہتے رہے تاہم ہم آرمی پبلک سکول کے زخمی طالب علموں کو بچانے میں ثابت قدم رہے۔ اپنے کیریئر کے دوران ایک ترین ان کے متعلق اس اہلکار کا مزید کہنا ہے کہ یہ دس گھنٹوں پر محیط ایک طویل ریسکیو آپریشن تھا جہاں دہشت گردوں اور آرمی کمانڈوز میں مسلسل فائرنگ کا تبادلہ بھی جاری تھا تاہم اس دوران میرے ذہن میں ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ اگر کوئی گولی مجھے بھی لگ سکتی ہے اور میں بے خوف اپنے کام میں مگن رہا۔

ریسکیو 1122 کے ڈائریکٹر آپریشن ڈاکٹر محمد ایاز کا میڈیا کو تفصیلات بتاتے ہوئے کہنا تھا کہ ہسپتال پہنچانے سے قبل موقع پر 120 زخمیوں کو ابتدائی طبی امداد دی گئی جبکہ ریسکیو اہلکار 94 نعشوں کو بھی باہر نکالنے میں کامیاب رہے۔ ریسکیو کے ڈائریکٹر آپریشن محمد ایاز کے بقول ہمیں اس واقعے کے متعلق سب سے پہلے ایک طالب علم نے اطلاع دی۔ اطلاع ملتے ہی فوراً ہم نے ابتدائی طبی امداد کی سہولیات سے لیس 18 ایمبولنس متاثرہ سکول روانہ کر دیں اس کے علاوہ 18 ایمبولنس اور الخدمت فاؤنڈیشن کی چار ایمبولنس بھی اس میں شریک رہیں۔ ریسکیو آپریشن کے دوران بے ہوش طالب علموں کو ایمبولنس میں ہی آکسیجن مہیا کی جاتی رہی جبکہ معمولی زخمیوں کی مرہم پٹی کی سہولت بھی ایمبولنس میں ہی مہیا کی گئی۔

محمد ایاز کے بقول ہم نے آپریشن میں شریک ریسکیو اہلکاروں کو گروپس میں تقسیم کر کے مختلف مقامات پر تعینات کر رکھا تھا تاکہ شدت پسندوں کی جانب سے دستی گرینیڈ یا فائرنگ کے حملے میں کم سے کم جانی نقصان ہو جبکہ اس وقت سکول کے اندر جانے والی ٹریفک کی ذمہ داری بھی میں نے خود اپنے سر لی تھی کیونکہ ٹریفک پولیس کو سکول کے اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ محمد ایاز نے مزید بتایا کہ سکول کے آڈیٹوریم میں موجود دہشت گردوں کو جس وقت مار دیا گیا اس وقت ریسکیو اہلکار آڈیٹوریم میں داخل ہو گئے جہاں ہر طرف زخمی اور نعشیں بکھری پڑی تھیں۔ حالانکہ اس وقت سکول کے ایڈمنسٹریشن بلاک میں فائرنگ کا سلسلہ جاری تھا۔ ریسکیو اہلکاروں کے بقول زیادہ تر اموات آڈیٹوریم میں ہی ہوئیں۔

ریسکیو 1122 کے ایمرجنسی آفیسر کمال شاہ کہتے ہیں ہماری ایمبولنس ایک چھوٹے ہسپتال کی مانند ہیں جس کی بدولت کئی زخمیوں کی زندگیاں بچائی گئیں کمال شاہ کے بقول میں اور میرے دیگر ساتھیوں نے اس طویل آپریشن میں انتہائی تندہی سے طلباء کو ریسکیو کیا اس دوران ہمارے حوصلے کسی بھی لمحے پست نہیں ہوئے تاہم آپریشن مکمل ہونے کے بعد میں ساری رات سو نہیں پایا کیونکہ جب ان معصوم بچوں کی چیخ و پکار اور ان کے چہرے یاد آتے تو میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے یہی حال میرے باقی ساتھیوں کا بھی تھا ساری رات جاگتے رہنے سے ان کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ ریسکیو اہلکاروں کے بقول ہمارے لئے یہ آپریشن دہشت گردی کے دیگر واقعات سے مختلف تھا کیونکہ اسکے سارے متاثرین بچے تھے۔

Download Books about History, Islamic, Romance, Horror,Novels, Poetry, Education and Much More....

www.freepdfpost.blogspot.com

مجھے بچائیں...

کرۂ ارض کا انسانوں کے نام خط

محمد نیاز

میرے باشندو! میرا نام کرۂ ارض ہے اور میں پوری کائنات میں واحد سیارہ ہوں جو زندگی کے اثرات رکھتی ہے۔ میں کئی لاکھ سال پہلے پیدا ہوئی جب انسان میرا باشندہ نہیں تھا۔ وہ میری زندگی کا ایک پرامن اور مثالی وقت تھا اور مجھے عصر حاضر کے خطرات کے ساتھ اس وقت کا موازنہ کرنے سے بہت دکھ ہوتا ہے۔

اس وقت وسیع زمینی و پہاڑی سلسلوں پر ہریالی ہوا کرتی تھی۔ در حقیقت یہ رحمت قدرت کا شاہکار تھا۔ سمندر، ندیاں، نہریں اور پانی کے دوسرے ذخائر میرے وجود میں رگوں کے طور پر پھیلے ہوئے تھے۔ وہاں ہم آہنگی تھی اور تمام جانور اور پودے اپنی اپنی زندگی کو مکمل کرتے تھے۔ ایک قدرتی توازن موجود تھا جس سے مختلف قسم کے جانور ایک دوسرے سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ درخت، پرندے، پودے، جانور، کیڑے مکوڑے اور دوسرے رینگنے والے جانور پر امن باشندے تھے۔

ابتدائی زمانے کے لوگ میرے حیاتیاتی نظام کا اہم حصہ تھے اور ان کا میرے وسائل پر کسی نہ کسی طرح براہ راست انحصار تھا۔ انہوں نے سادہ زندگی گزاری اور مجھ سے اپنی ضروریات کو پورا کیا اور میں ان دنوں پھل پھول رہی تھی۔ میں حیاتیاتی وسائل سے مالا مال تھی۔ پھولوں اور جانوروں کی ہزاروں اقسام تھیں لیکن وہ آہستہ آہستہ بدلتے ہوئے حالات اور بربادی کی وجہ سے ناپید ہو گئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی تعداد میں کمی واقع ہوتی گئی اور انسانوں کی آبادی نہایت تیزی سے بڑھتی گئی۔

میرے انسان باشندو! آپ نے مجھ سے بے رحمی کا سلوک جاری رکھا اور ابتدائی انسان اور مجھ میں پائی جانے والی ہم آہنگی کو بھول گئے۔ آپ بہت ناشکرے مخلوق ہو، آپ نے اللہ کی نعمتوں کی قدر نہیں کی۔ آپ قدرتی دولت کا انتہائی لاپرواہی اور بے دردی سے استعمال کر رہے ہیں کہ آپ اپنی آنے والی نسلوں کی ضروریات کا بھی نہیں سوچتے۔ کاش! آپ ترقیاتی کاموں، سماجی و اقتصادی ترقی کی وجہ سے پودوں اور جانوروں میں پائی جانے والی بے چینی اور گھبراہٹ کو سمجھتے۔

ذرا جنگلی حیات کی بولی بھی سمجھ
صرف الفاظ سے اظہار ضروری تو نہیں

آپ کو ایک سچے اور مخلص باشندے کی طرح عمل کرنا چاہیے تھا لیکن آپ نے میرے ساتھ دشمنوں جیسا سلوک کیا اور غفلت کر رہا اور کرنے کی بجائے بے حساب وسائل اور ماحول کو تباہ و برباد کرنے پر تلے رہے۔ اس بربادی کی وجہ سے میرے جانور دوست فرار ہو کر غائب ہو گئے ہیں۔ آپ اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے درختوں کو کاٹ رہے ہیں۔ درختوں کی کٹائی کی وجہ سے میرے پرندے دوست کافی متاثر ہو گئے ہیں۔ ان کے مساکن اور گھونسلے تباہ ہو گئے ہیں۔

مجھے حیرت ہے کہ آپ کیوں قدرت کی عطا کردہ نعمتوں کے ناشکرے ہو گئے کہ آپ کو ان وسائل کی اہمیت کا بالکل احساس نہیں ہے۔ آپ کی بڑھتی ہوئی اقتصادی سرگرمیوں کی وجہ سے گلوبل وارمنگ اور ماحولیاتی تبدیلی میری صحت کو برباد کر رہی ہیں جس سے میرے جسم پر گھمبیر پھیل رہے ہیں۔ فیکٹریوں سے فضلہ جات کا اخراج، گاڑیوں سے دھوئیں کا اخراج اور دیگر آلات مسلسل ماحول کو تباہ کر رہے ہیں۔

پیارے انسانو! آپ کی بڑھتی ہوئی آبادی اور ان کی ضروریات اور لالچ کی وجہ سے مجھ پر بوجھ بڑھ رہا ہے۔ میری سالمیت اور جسامت ایک سی ہے لیکن انسانوں کی آبادی سات ارب سے تجاوز کر گئی ہے جو میرے وسائل پر ناقابل برداشت بوجھ ہے۔ سماجی اور اقتصادی سرگرمیوں نے آپ کو مجھ سے لاتعلق کر دیا ہے کہ آپ کی مجھ میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی۔ لہذا آپ نے مجھے نظر انداز کر دیا ہے۔ مجھ میں عدم تحفظ کا احساس دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ اب وقت آیا ہے کہ مجھے واقعی ایک Captain Planet کی ضرورت ہے جو میرے اور میرے وسائل کی حفاظت کرے۔ میرے علاوہ میرے ہوائی، زمینی اور آبی دوستوں میں بھی عدم تحفظ کی تشویش بڑھتی جا رہی ہے۔ آپ مجھے ماں کہتے ہیں۔ اس تناظر میں حیاتیاتی طبقے میرے بچے ہیں۔ لیکن یہ نہایت ہی حیران کن بات ہے کہ آپ ہی واحد ہستی ہو جو مجھے غلط استعمال کر رہے ہو اور مجھے نقصان پہنچا رہے ہو۔

مجھے معلوم ہے کہ جدید دور میں آپ نے ہر شعبے میں شاندار تکنیکی ترقی کی ہے لہذا شعور کی سطح میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے لیکن اس کے باوجود میری صحت مسلسل بگڑ رہی ہے۔ مجھے جدید دور کے بچوں سے کیا امید رکھنی چاہیے جو جدید ٹیکنالوجی کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں لیکن وہ اپنے ارد گرد درختوں اور پودوں کے نام تک نہیں جانتے اور نہ ہی ان درختوں اور پودوں کو درپیش خطرات کا ان کو علم ہے۔ جب ان کا زیادہ تر وقت کھیل اور الیکٹرانکس کے سامان کے ساتھ گزرتا ہے تو وہ کس طرح میرے لئے اور میرے وسائل کو بچانے کے لئے وقت نکالیں گے۔ آپ میں صرف چند لوگ ہو گے جن کو اس امر کا احساس ہوگا۔ میرے ان قدرتی وسائل سے زیادہ عرصے تک فوائد حاصل کرنے کے لئے انفرادی و اجتماعی کوششوں کی ضرورت ہے۔ آپ ہر سال کرۂ ارض کا عالمی دن 22 اپریل کو منانے کے علاوہ کئی اور ماحولیاتی دن بھی مناتے ہیں لیکن اس کے باوجود دکھاوے کی خاطر خواہ تبدیلی اور مجھ پر ان کے مثبت اثرات مرتب نہیں ہوتے۔

میں عام طور پر تمام بنی نوع انسان اور خاص طور پر بچوں سے اپیل کرتی ہوں کہ مجھے بچانے میں اپنا کردار ادا کریں۔ اگر آپ کو اپنا خیال رکھنا ہے تو آپ کو میرا خیال رکھنا ہوگا۔ مجھے جو کچھ بھی ہو رہا ہے تو اس کے اثرات بڑے پیمانے پر آپ سب پر برابر پڑیں گے۔

آپ کا مخلص۔

خطرے سے دوچار کرۂ ارض۔

مضمون نگار خیبر پختونخوا وائلڈ لائف ڈیپارٹمنٹ میں ڈپٹی کنزرویٹر ہیں

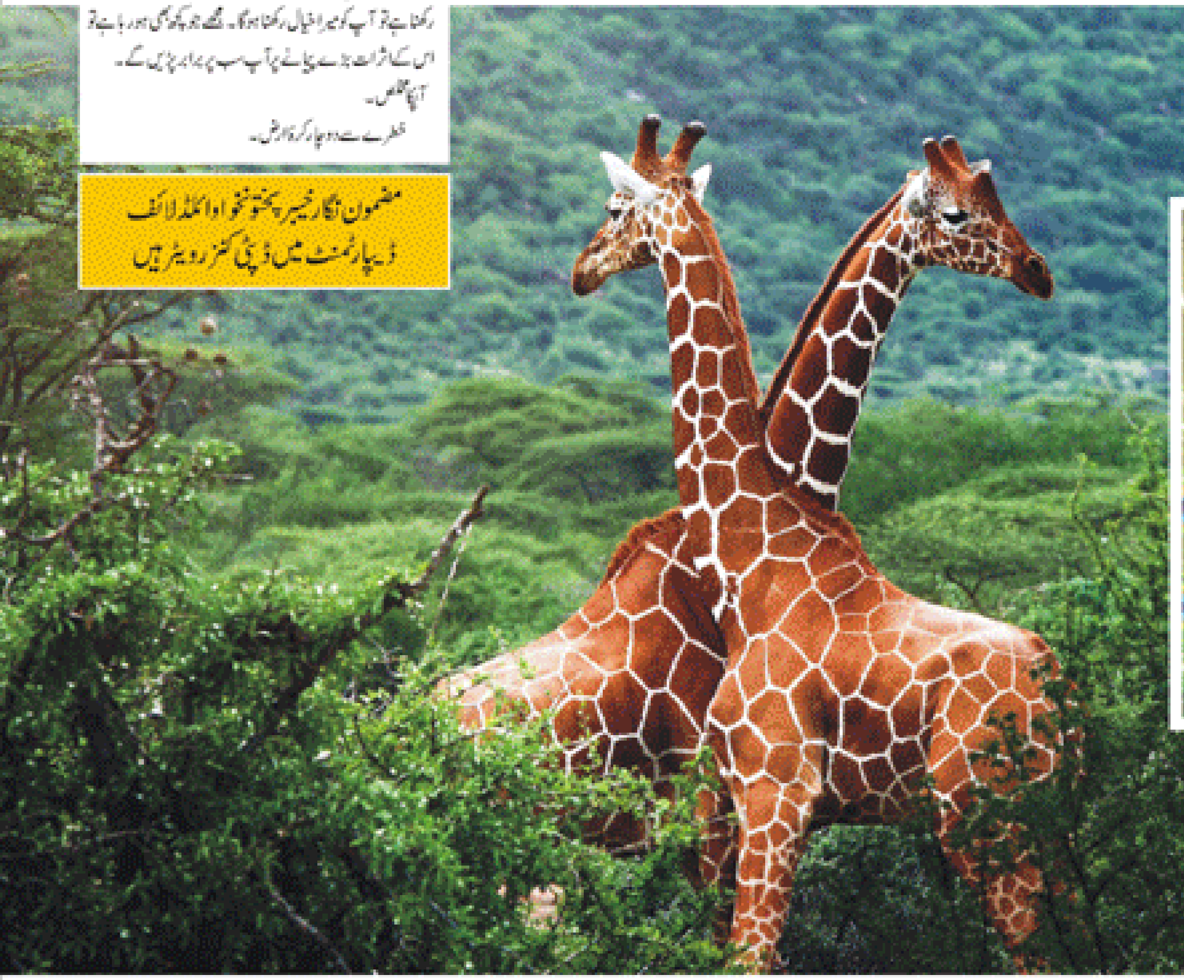

روحانی مسائل

قرآن وسنت کی روشنی میں

مولانا عبدالغفار قادری

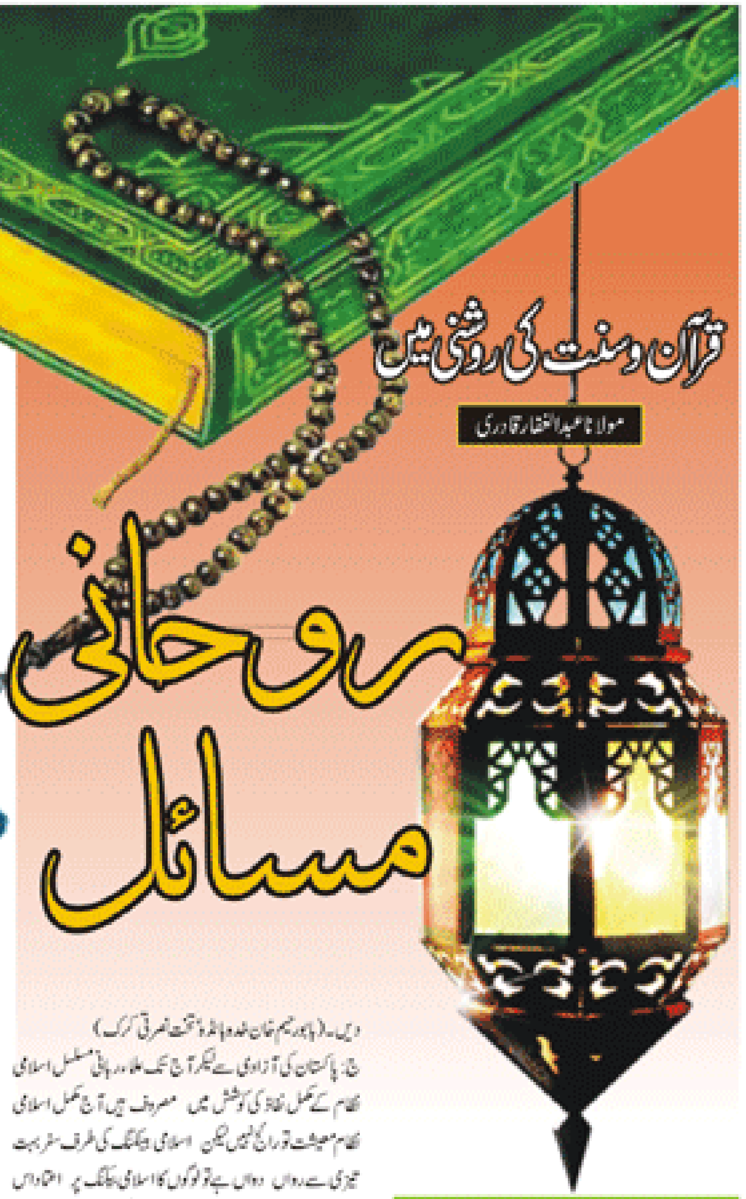

تعبیر

س: 1947ء میں ملک اسلام کے نام پر بنا لیکن آج تک سود سے پاک معیشت "نظام زکوٰۃ" نظام عدل وانصاف قائم نہ ہو سکا نہ ہی قائم کرنے کی کارروائی کی گئی ہیں۔ اکثر بحث کرتا ہوں کہ ہماری جماعت اب ملک میں ایک موثر قوت بن گئی ہے اب اسلامی نظام معیشت "عشر و زکوٰۃ" کے لئے موثر آواز اٹھائے کیونکہ سودی معاملات تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ جنگ ہے مگر وہ جواب دیتے ہیں کہ جب ہمارے سارے اعمال درست ہو جائیں گے تو تب جا کر یہ بھی ٹھیک ہوں گے میں اس جواب سے مطمئن نہیں کیونکہ ہر کام کی تکمیل کے لئے انتہائی کوشش درکار ہوتی ہے میں اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی اور باوضو سو گیا کہ اس رات میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک بڑی نہر ہے پانی کی مگر اس میں پانی نہیں ہے اس کے بعد اسی رات کو دوسرا خواب دیکھا کہ ایک خوبصورت پانی کا تالاب ہے اس کو چونا لگا ہے مگر اس میں پانی نہیں ہے مجھے اس خواب کی تعبیر بتا دیں۔ (بابو رحیم خان خدو ماندہ و تخت نصرتی کرک)

ج: پاکستان کی آزادی سے لیکر آج تک علماء ربانی مسلسل اسلامی نظام کے مکمل نفاذ کی کوشش میں مصروف ہیں آج مکمل اسلامی نظام معیشت تو رائج نہیں لیکن اسلامی بینکنگ کی طرف سفر بہت تیزی سے رواں دواں ہے تو لوگوں کا اسلامی بینکنگ پر اعتماد اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے دلوں میں اپنے لین دین کے معاملات کو اسلامی طریقے پر عمل پیرا ہونے کا مکمل ارادہ ہے صرف ان کو سہولیات دی جائیں اسلامی بینکاری کا دائرہ کار بڑھایا جائے اس کے ساتھ ساتھ معاشرے میں ایسے راہزن نما رہبروں کی بھی کمی نہیں جو سادہ لوح عوام کو دولت مختصر عرصے میں ڈبل کر دینے کے دھوکے دیکر دین کے نام پر لوگوں کو اسلامی نظام تجارت سے متنفر کر رہے ہیں دین کے نام پر بے دینی پھیلا رہے ہیں ایسے دھوکے بازوں سے بھی ہم دین سے محبت کرنے والوں کو چوکنا رہنا ہوگا آپ نے جو خواب دیکھے ہیں ان کی تعبیر واضح ہے کہ جس جماعت سے آپ وابستہ ہیں ان کی محنت ومشقت بہت ہے لیکن اصل چیز ان کے پاس نہیں ہے بنیادی فائدے سے خالی ہے۔ نہر اور تالاب کا بنیادی مقصد پانی ہے جس سے زندگی ہے لوگوں کو لاتعداد فائدے ہیں وہ چیز یہاں نہیں ہے جتنی محنت اسلام کی آبیاری کے لئے بڑے بزرگوں نے کی کہ لوگوں کا عقیدہ محفوظ ہو عمل محفوظ ہو بعد کے لوگوں سے وہ کام نہیں ہوا بلکہ ان کی محنت ضائع ہوتی جا رہی ہے۔ وہ حقیقی کی دو عملی بڑھتی جا رہی ہے اصلاح کا ہر عمل اپنی ذات سے شروع کر کے اسے پہلے اپنے گھر میں نافذ کر کے گھر سے باہر نکالنا چاہئے خود احتسابی کے بعد دوسروں کی اصلاح موثر ہوتی ہے جس کا اپنا دل صاف ہو وہ دوسرے کے دل کو صاف کر سکتا ہے جس کے اپنے دل کی شمع پر اللہ عزوجل اور اس کے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کی آگ جل رہی ہو اس کے دل سے ہدایت کی روشنی نکلتی ہے جس کے اپنے دل کا چراغ بجھا ہوا ہو وہ دوسرے کے چراغ کو روشنی کیسے دے سکتا ہے۔

جان چھوڑ دے

س: چند سال پہلے ایک انسان کے ساتھ نوجوانی کے عالم میں غلط تعلق قائم ہوا شیطانی بہکاوے میں تعلق کافی دور تک چلا گیا اب ہوش آیا کہ یہ تو بہت غلط ہوا اب اس تعلق کو ختم کرنا چاہتا ہوں لیکن وہ دوسرا فریق راضی نہیں اور مختلف دھمکیوں وغیرہ سے ڈراتا ہے کوئی مالی و جسمانی نقصان بھی اٹھا چکا ہوں کوئی وظیفہ بتا دیں کہ میری جان چھوٹ جائے اللہ تعالیٰ بھی مجھے معاف کر دے۔ (ایک بھائی)

ج: برائیوں کو چھوڑنے کی کوشش کرنا اس سے جان چھڑانے کے طریقوں کو سوچنا بھی نیکی ہے اگر ہم اپنی موت قبر میں کیسے جائیں گے اپنے سامنے رکھیں تو گناہوں سے دل متنفر ہو سکتا ہے آج کل سردی کا موسم ہے رضائی کمبل لحاف وغیرہ اوڑھ کر جب رات کو لیٹیں تو یہ تصور کریں کہ یہ کمبل رضائی وغیرہ کفن ہے کمرے کی تاریکی قبر کی تاریکی ہے اور چارپائی میری قبر ہے پھر اپنے اعمال کا محاسبہ کریں کہ کتنے ٹھیک ہیں اور کتنے غلط چند دن کے اس عمل سے آپ کو دنیا کی ناپائیداری کا احساس ہوگا۔ حساب کتاب قبر کے عذاب کا تصور سامنے رہے گا پھر گناہوں کو چھوڑنا بھی شروع کریں گے اور اس حقیقی زندگی کو پاکیزہ طور پر گزارنے کا عمل شروع کر سکیں گے۔ اگر آپ کے اندر گناہ سے نفرت پیدا ہو گئی ہے تو یہ بڑی کامیابی ہے۔ گناہ سے بچنا پھر آسان ہو جاتا ہے اس دوسرے انسان سے نجات کے لئے "یا مانع" 436 بار پڑھ کر اس کا تصور کر کے اس پر دم کریں اس کے علاوہ مغرب کی نماز کے بعد "صم بکم عمی فھم لا یرجعون" 120 بار پڑھ کر دعا کریں کہ اللہ کریم آپ کو اس سے نجات عطا فرمائے اور اس کو بھی ہدایت عطا فرمائے۔ آمین۔ مطلوبہ نتائج کے حصول تک وظیفہ جاری رکھیں اگر کبھی مصروفیات وغیرہ کی بنا پر رہ جائے تو اگلے دن ڈبل تعداد میں پڑھیں۔

کھانا کھانے کو دل نہیں چاہتا

س: میں مدینہ منورہ میں روزگار سے وابستہ ہوں۔ دو سال بعد چھٹی پر آتا ہوں اس دفعہ جب سے آیا ہوں کھانا کھانے کو دل نہیں کرتا۔ پورے دن میں دوپہر کا کھانا کچھ نہ کچھ شوق سے چند نوالے کھا لیتا ہوں پھر بھوک ختم ہو جاتی ہے۔ صبح ناشتہ اور رات کا کھانا تو بالکل بھی نہیں کھا سکتا۔ رشتہ دار دعوت کا اہتمام کرتے ہیں میں جا کر کچھ بھی نہیں کھاتا۔ ایک رشتہ دار نے آپ کا بتایا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ کرم سے مسئلے کا حل بتا دیں پوچھوں براہ مہربانی جلد از جلد جواب دے کر ممنون فرمائیں۔ (محمد نعیم خان کوہاٹ)

ج: آب و ہوا اور کھانے پینے کے معمولات میں تبدیلی سے ایسے اثرات ہوتے ہیں یہ کوئی خطرناک بات نہیں جادو سحر کا کوئی اثر نہیں کچھ دنوں میں معمولات بحال ہو جائیں گے رات کے کھانے کے دو گھنٹے بعد ایک چمچ اسپغول کی بھوسی منہ میں رکھ کر اوپر سے پانی پی لیں چند دن مسلسل یہ عمل کریں پھر بھی کمی نہ کریں 21 دن بعد دوبارہ رابطہ کریں۔

لقوہ

س: میرے دوست جس کی عمر 25 سال ہے اس کو لقوے کا مرض ہے علاج معالجے سے کافی فرق آیا ہے لیکن تھوڑا سا فرق ابھی بھی باقی ہے۔ چہرہ دیکھا ہوا ہے ایک آنکھ اور چہرے کا ایک حصہ ہونٹ ابھی بھی متاثر ہیں مکمل بند نہیں ہوتے کوئی روحانی علاج بتا دیں کہ جو تھوڑی سی کمی رہ گئی ہے وہ بھی پوری ہو جائے اور مکمل شفایاب ہو جائے۔ (مظفر خان دیر)

ج: اس مرض کے مکمل خاتمے کے لئے وظیفہ پڑھنا نقوش پہننا ضروری ہے۔ وظیفہ ایڈیشن کے ذریعے بتا رہا ہوں نقوش کے حصول کے لئے جوابی لفافے پر مکمل ایڈریس لکھ کر بھیج دیں۔ انشاء اللہ العزیز نقوش بھیج دیئے جائیں گے۔ "یا حی" 313 بار پڑھیں اول آخر سات بار درود پاک پڑھیں۔

فحش گوئی نسوار کی عادت

س: میرے بھائی کی عمر 20 سال ہے بہت غلط زبان چلاتا ہے چھپ چھپ کر نسوار بھی استعمال کرتا ہے جب اسے سمجھاؤ تو انکار کرتا ہے۔ جھوٹ بولتا ہے گھر میں تو پابندی رہتی ہے گھر سے باہر کنٹرول کرنا مشکل ہے کوئی وظیفہ بتا دیں کہ وہ خود بخود ہی ایسے کاموں کو چھوڑ دے۔

(جلال الدین صوابی)

ج: بچپن سے ہی بچے کی تربیت کرنی چاہئے۔ برے لوگوں سے دور رہنے کی تعلیم دینی چاہئے ایسا بچہ جس کو بچپن سے اچھے برے کی تمیز سکھائی گئی ہو اگر غلط طرف جائے گا تو گناہ کے احساس کے ساتھ جائے گا پھر اس کی واپسی آسان ہوگی اگر بہت اچھی تربیت دی گئی ہو تو غلط طرف جانے سے بچ جائے گا۔ بچوں کو ابتداء ہی سے نشہ آور چیزوں کے نقصانات ذہن نشین کرا دینے چاہئیں تاکہ آئندہ کوئی انہیں راہ سے بھٹکانے لگے تو ان کے ذہن میں نقصانات کا تصور موجود ہو۔ برے اخلاق عادات نشہ آور اشیاء کے استعمال سے نجات کے لئے "یا ودود" 960 بار اول آخر گیارہ بار درود پاک پڑھیں جب تک مسئلہ حل نہ ہو جائے وظیفہ جاری رکھیں۔

دل کا زنگ

س: میں نماز پڑھنے کا ارادہ کرتا ہوں لیکن اس پر عمل نہیں ہوتا ابھی پڑھتا ہوں کرتے کرتے وقت نکل جاتا ہے مگر کام جو روزمرہ کے ہوتے ہیں اس میں بھی سست واقع ہوں تمام پر کام نہیں ہوتا کوئی وظیفہ بتا دیں کہ یہ سستی نکل جائے۔ (عاطف شاہ زمن)

ج: گناہوں کی کثرت سے دل کو زنگ لگ جاتا ہے۔ یہ علامت اسی چیز کی معلوم ہوتی ہے اپنے اعمال کی اصلاح کیجئے اپنے طرز عمل پر نظر دوڑائیں جہاں کمی ہے اس کی اصلاح کی تدبیر کریں بطور وظیفہ "لا الہ الا اللہ" پڑھیں 300 بار پڑھیں ہر 100 پورا ہونے پر ایک بار "محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" پڑھیں۔ "لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم" 100 بار پڑھیں۔ تلاوت قرآن پاک کی عادت بنائیں۔ آہستہ آہستہ یہ عادتیں ختم ہوتی جائیں گی اس کے علاوہ مطالعے کا شوق بنائیں۔ فائدے اور نقصان کو سوچ کر عمل کریں گے تو دل خلوص سے عمل کرے گا جو عمل خلوص سے ہوتا ہے اس کا اثر بھی ہوتا ہے جو عبادت جان چھڑانے کے لئے ہو اس کی برکات نہیں ملتی صرف فرض ادا ہوتا ہے جس سے مسائل کم نہیں ہوتے عبادت عبادت کے طریقے پر کریں عادت کے طور پر نہیں۔

بزیرا بنا بریکوٹ

سوات کی حسین وادیوں میں ہزاروں برس پرانی داستانیں بکھری پڑی ہیں

فرہاد علی خاور

دنیا کی حسین ترین وادی سوات جغرافیائی لحاظ سے ایک اہم مقام ہے جہاں برِاعظم ایشیاء کے تین اہم خطے جنوبی ایشیاء، وسطی ایشیاء اور چین ایک دوسرے سے باہم ملتے ہیں۔ سوات ازمنہ قدیم سے آباد علاقوں میں سے ایک ہے اس قدیم علاقے کا ذکر ہندوؤں کی مقدس اور قدیم ترین کتاب رگ وید میں بھی موجود ہے۔ یہاں انسانی آبادی کے 40 ہزار سال قبل تک کے آثار موجود ہیں۔ سوات میں قدم قدم پر تاریخی اور ثقافتی آثار موجود ہیں۔ اس سرزمین نے ہزاروں سال میں کئی خونریز انقلابات کا سامنا کیا۔ کئی تہذیبوں کی اس سرزمین پر گزر ہوئی سکندر اعظم اور سکندر یونانی جیسے عظیم فاتحین کے قدم چومنے والی یہ سرزمین مختلف ادوار میں مختلف تہذیبوں کا مسکن رہی۔ آریاؤں، ایرانیوں، یونانیوں، تاتاریوں، ترکوں، مغلوں، افغانوں اور انگریزوں نے اس سرزمین پر یلغار کی۔ سکندر اعظم یونانی کے حملے میں اس سرزمین پر ایک شہر بزیرا کے بارے میں مورخین نے بہت کچھ لکھا ہے جس پر قبضے کے لئے سکندر کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ سکندر اس حصار بند شہر کو فتح کرنے کے لئے پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس شہر کے حصار کی بلندی آسمان کو چھو رہی تھی سکندر جیسے قابل سپہ سالار کو بھی اس شہر پر قبضہ کرنا مشکل لگ رہا تھا یونانی مورخین بلند و بالا حصار شہر بارے کچھ یوں رقم طراز ہیں "بزیرا کے گرد بلند اور مضبوط حصار قائم تھا توڑ پاس میں سوراخ کرنا ممکن تھا اور نہ ہی سیڑھی لگا کر اندر داخل ہونا ممکن تھا یہ شہر اس خطہ کے تمام شہروں میں سب سے مضبوط اور ناقابل تسخیر شہر تھا۔ حصار شہر کے اوپر تیر اندازوں کا دستہ حملہ آوروں کے لئے جان لیوا تھا اس حصار بند شہر کو محققین نے بھی خطرناک قرار دیا تھا آریان کے مطابق بزیرا ایک بلند جگہ پر واقع تھا اور اس کی قلعہ بندی بہر لحاظ سے مضبوط تھی وہاں کے لوگوں نے اپنی مضبوط پوزیشن پر بھروسہ کیا اور ہتھیار ڈالنے کا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ سکندر کا خیال تھا کہ بزیرا کے لوگ مساگا کی شکست کا حال سنتے ہی ہتھیار ڈال دیں گے سکندر نے حکمت عملی تبدیل کی اور اپنی فوجوں کا رخ پہلے اورا کی طرف پھیر دیا جسے اس نے پہلے ہی حملے میں فتح کر لیا جب بزیرا کے لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ اورا فتح ہو گیا تو بزیرا کے لوگ ہمت ہار گئے اور رات کے اندھیرے میں شہر سے نکل کر قریب ہی ایک ٹیلے پر چڑھ گئے جو اورناس کہلاتا تھا سکندر کے دل میں یہ بات سمائی کہ اس پہاڑ پر بھی قبضہ کر لیا جائے سکندر نے اورا اور مساگا کی قلعہ بندی اور مضبوط کر کے بزیرا پر قبضہ کر کے اس حصار بند شہر کے دفاع کو مستحکم کیا۔ شہر بزیرا ایک اونچے پہاڑ پر واقع تھا جس کی چوٹی تک آبادی پھیلی ہوئی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خود پہاڑوں نے اپنے آپ کو مقابلے کے لئے مسلح کر لیا ہے۔ یہاں سے مقدونی سکندر کو سفید رنگ کی بہت بلند چوٹیاں نظر آئیں جو پہرے داروں کی طرح کھڑی تھیں۔ سرو یکر نے اپنے حساب کے مطابق اس بلندی کا اندازہ لگا کر کہا کہ یہ کرہ ہوا سے اوپر اُٹھ کر عرش تک پہنچی ہوئی ہے، رہبروں نے بتایا کہ اس سے آگے وہ بلندیاں ہیں جن کی حفاظت اندرا دیوتا کر رہا ہے وہ بلند تر خطا میں آسمانوں اور طوفانوں کے درمیان رہتا ہے۔ سکندر کو ایسی چوٹیاں نظر آ رہی تھیں جو اس نے بھی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں اس راستے سے کوئی فوج نہیں گزر سکتی تھی چنانچہ وہ پیچھے لوٹا اور دریائے سندھ کی جانب سے اُترنے کو آیا۔ یہ اس بزیرا شہر کی کہانی ہے جو آج بریکوٹ کے نام سے مشہور ہے اور جس پر سکندر نے اڑھائی ہزار سال قبل حملہ کیا تھا

وہ شہر انقلابات زمانہ کے ہاتھوں ہزاروں سال سے زمین میں دفن ہو کر دنیا کی نظروں سے غائب رہا۔ جہاں بلند و بالا عمارتیں عبادت گاہیں اور شاہی محل تھے اور جس کے تذکرے یونانی مورخین کے جنگی ناموں میں موجود تھے لیکن صفحہ ہستی پر یہ شہر موجود نہیں تھا ماہرین اور محققین اس گم شدہ شہر کی تلاش میں تھے۔ ماہرین آثار قدیمہ نے خیال ظاہر کیا ہے کہ بزیرا دراصل بریکوٹ ہے جو وسطی سوات میں اس جگہ واقع ہے جہاں سے ایک چھوٹی سی سڑک بڑی وادی سے کٹ کر دورہ کڑا کر کے پار ہو ٹیر تک جاتی ہے یہاں بہت سے آثار قدیمہ ہیں جن میں قدیم یونانی طرز کا بالا حصار وادی کے وسط میں بڑی اہم جگہ پر واقع ہے۔

ماہرین اس بات پر زور دیتے ہیں کہ بزیرا ہی بدل کر بریری اور اس کے ساتھ کوٹ کا اضافہ ہو کر بریکوٹ بن گیا بعض لوگوں نے بزیرا شہر کے محل وقوع بارے مختلف مقامات بتائے۔ 1984ء کو سر آرل سٹائین اور پروفیسر گوسپ ٹوچی نے اس قدیم شہر بزیرا کی تلاش میں یونانی مورخین اور ہمعصر یونانی فوجی کمانڈروں کی تحریروں کی روشنی میں اس شہر کے محل وقوع کے بارے میں سروے شروع کیا انہیں اپنی کوششوں میں اس وقت کامیابی حاصل ہوئی جب موجودہ بریکوٹ گاؤں سے مغرب میں کچھ فاصلے پر اس گمشدہ شہر کے کھنڈرات مل گئے۔

ماہرین آثار قدیمہ نے کھدائی کا آغاز پہلے مرحلے میں چار مختلف جگہوں پر کھدائی سے کیا۔ کھدائی کے دوران ایک خندق "جو BKGI کے نام سے تحریر اور جس کی لمبائی 10 x 5 میٹر اور گہرائی 9.32 میٹر ہے سے دوسری اور تیسری صدی قبل مسیح کے آثار ملے۔ دوسری خندق BKG2 کے نام سے تحریر ہے سے ہندو شاہی دور کے آثار ملے۔ تیسری خندق جو کہ BKG3 سے تحریر ہے سے کشان دور کے آثار برآمد ہوئے۔

چھوٹی خندق سے جو پہاڑی کے دامن میں سب سے بڑی کھدائی اور جو مسیح کی طرف سے پیریڈ ہے ہندی اور یونانی دور کی فصیل شہر کے آثار برآمد ہوئے۔ یہ فصیل شہر چھٹے سے تعلق رکھتی ہے 1998ء میں کھدائی کو پہاڑی کی جانب وسعت دی گئی اور چار مزید خندقیں کھودی گئیں اس کھدائی سے 2 ہزار سال قبل مسیح یعنی چار ہزار سال قدیم آثار دریافت ہوئے ایک خندق کی کھدائی کے دوران برھمنوں کی عبادت گاہ دریافت ہوئی۔ 1999ء کو کھدائی کے دوران یہیں سے شاہی خاندان کے آثار ملے پہاڑی چوٹی کے اوپر اٹلی کے ماہر آثار قدیمہ کو کچھ انسانی آثار ملے جو دو ہزار سال قبل مسیح کے ہیں۔ شہر بزیرا کی دریافت میں اٹلی کے عالمی شہرت یافتہ ماہر آثار قدیمہ ڈاکٹر لوکا کی خدمات ناقابل فراموش ہیں جنہوں نے اس قدیم تاریخی شہر کو دنیا کے سامنے لانے کے لئے اپنی زندگی کا ایک طویل عرصہ صرف کر دیا جوانی سے لے کر بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انہوں نے اپنی زندگی بزیرا شہر کی تلاش میں گزار دی۔ وطن سے دور پختونخوا کی پرخطر پہاڑیوں میں ایک یورپی شخص کا زندگی گزارنا تقریباً ناممکن ہی تھا لیکن اس شخص کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ہر قسم کے خطرات کے باوجود اس شخص کے عزم میں کوئی کمی نہیں آئی حتیٰ کہ سوات میں حالیہ دہشتگردی کے دور میں بھی یہ بہادر آدمی اپنے چند قابل اعتماد پاکستانی مزدوروں کے ہمراہ جن میں فضل عظیم، فضل مالک، شاہ محمد، عابد، عمر واحد، یاسین خان شامل تھے جان کی بازی لگاتے ہوئے اپنے فرض کی ادائیگی میں مصروف رہا۔ جب سوات سے تمام لوگ ہجرت کر گئے تو ڈاکٹر لوکا اور ان کے پاکستانی مزدور جانباز ساتھی ان لوگوں میں شامل تھے جو سب سے آخر میں نکلنے پر مجبور ہوئے۔ یہ لوگ واقعی خراج تحسین کے مستحق ہیں۔ بزیرا کی کھدائی مسلسل جاری رہی 2006ء کو یہاں پر ہونے والی کھدائی کے دوران یہاں بدھ مت کی دو عبادت گاہوں کے آثار دریافت ہوئے یہاں سے قیمتی نوادرات اور بدھ مت مورتیاں بھی برآمد ہوئیں جو سوات میوزیم کی زینت بن چکی ہیں حال ہی میں BKG12 کے نام سے بہت بڑی کھدائی ہوئی جس کے دوران دوسری اور تیسری صدی عیسوی کے آثار نمودار ہوئے۔ بزیرا کی کھدائی ابھی مکمل نہیں البتہ 30 فیصد کھدائی کا کام مکمل ہو چکا ہے اس تحقیق سے اس شہر کے بارے میں مختلف ادوار میں آباد ہونے کے ثبوت ملتے ہیں کھدائی کے دوران اس عظیم شہر کی تباہی کے نشانات بھی ملے ہیں۔ تحقیق کے دوران اس بات کی بھی تصدیق ہوئی کہ شہر تیسری صدی کے آخر میں ساسانی دور میں ایک شدید زلزلے کے نتیجے میں مکمل تباہ ہو گیا تھا اور دوبارہ تعمیر کیا گیا تھا یہ شہر یونانیوں کے قبضے میں آیا تو اس شہر کی خوبصورتی میں مزید اضافہ ہوا شہر کے حصار کو مزید مضبوط اور مستحکم بنا دیا گیا شہر میں یونانی طرز کی تعمیرات کا بھی اضافہ ہوا ہندو یونانی دور میں بھی اس شہر کی شہرت تھی۔ کشان دور میں بزیرا شہر کی آبادی اور رونق میں مزید اضافہ ہوا اور اس شہر میں بدھ مت کی بڑی بڑی عبادت گاہیں تعمیر ہوئیں اس قدیم شہر میں برہمن مذہب کی عبادت گاہیں بھی موجود تھیں بدھ مت کے زوال پر یہاں بدھ مت کی خانقاہیں اور درسگاہیں ویران ہو گئیں تو اس شہر کی رونقیں بھی ماند پڑ گئیں۔ لیکن ہندوؤں کی آبادی موجود رہی۔ ہندو شاہی دور میں خاص کر جب افغانستان تک اسلامی لشکر پہنچ گئے تو وہاں سے بڑی تعداد میں ہندوؤں کی نقل مکانی اس جانب ہوئی یہ نقل مکانی سینکڑوں سال تک جاری رہی حتیٰ کہ ہندو شاہی کے ایوان اقتدار کابل سے ہنڈ صوابی منتقل کیا۔ اس زمانے میں سوات کے تمام شہروں کی طرح بزیرا کی آبادی اور رونقوں میں اضافہ ہوا اس کے ثبوت بھی کھدائی کے دوران ملے۔ ہندو شاہی دور میں یہ شہر وائے ہند (صوابی) کے حکمران راجہ جے پال کے زیر تسلط تھا ماہرین آثار قدیمہ کو اس دور کے کتبے اور سکے بھی ملے ہیں۔ کتبوں پر تحریر ہے کہ یہ علاقہ ہندو شاہی راجہ جے پال کا باجگزار تھا۔ مسلمان تو پختونخوا کے میدانی علاقوں مردان، صوابی تک عربوں کے زمانے میں کئی بار حملہ آور ہوئے اور دریائے سندھ تک پہنچ کر پھر لوٹ جاتے تھے لیکن جب 1001ء میں محمود غزنوی نے دریائے سندھ تک کا علاقہ فتح کر کے وائے ہند پر قبضہ کیا تو پہلے تو ہندو شاہی حکمرانوں کو باجگزار بنا کر چھوڑ دیا لیکن بہت جلد ہی اس علاقہ کو اپنے قلمرو میں شامل کیا۔ وائے ہند (صوابی) پر قبضے کے بعد غزنوی لشکر شمال کی جانب ہندوؤں کی ریاستوں کی جانب متوجہ ہوا۔ ہندوؤں نے قدم قدم پر بڑی مزاحمت پیش کی۔ اس حوالے سے جنگ بزوچ بہت مشہور ہے جس میں ہندوؤں نے سوات جانے والے پہاڑی درہ "درہ شاہ کوٹ، درہ ملندری اور درہ سرکاوی" پر اپنی بقاء کی آخری جنگیں لڑیں۔ غزنوی فوجوں کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش رہی بلکہ ہندوؤں کے پاس رسد و کمک پہنچنے کی کوئی امید تک نہیں رہی۔ جنگ بزوچ میں ہندوؤں کی شکست کے بعد مذہب اسلام کی آمد کے چار سو سال بعد سوات کی فضاؤں میں پہلی بار اللہ اکبر کے نعرے گونجے۔ اس وقت سوات ہندو راجا گیرا کی ریاست تھی جو ایک طاقتور، باہمت اور دلیر سردار تھا اس کا تعلق ہندو شاہی خاندان سے تھا جو کئی نسلوں سے سوات کا حکمران خاندان تھا لیکن وائے ہند کا باجگزار تھا چونکہ وائے ہند اب شاہی کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا لہذا اب سوات کے حکمران بھی آزاد اور خودمختار تھے جنہوں نے مسلمان حملہ آوروں کے ساتھ کئی خونریز جنگیں لڑیں ہزاروں مسلمان شہید ہوئے ان لوگوں کی یادگار آج اعظم کا تاریخی قبرستان ہے جو کسی زمانے میں کئی کلومیٹر پر محیط تھا۔ اس جنگ کی ایک یادگار اوڈیگرام کا تاریخی قبرستان ہے جہاں غزنوی لشکر کے ایک نامور سردار خوشحال بابا کی قبر موجود ہے۔ اس مقام پر ایک تاریخی فیصلہ کن جنگ لڑی گئی جس میں راجہ گیرا قتل اور مسلمان فتح یاب ہوئے اس کے بعد مسلمان لشکر بزیرا کے حصار بند شہر پر ٹوٹ پڑا اور اس عظیم شہر کو لوٹ مار کے بعد مکمل طور پر تباہ کر کے ملبے کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا۔ یہ اس شہر کی آخری تباہی تھی جس کے بعد یہ شہر زمین دوز ہو کر صفحہ ہستی سے مٹ گیا اب ایک ہزار سال بعد اس شہر گمشدہ کے آثار اٹلی کے ماہرین نے دریافت کئے ہیں۔

ماخذ: ہسٹری آف سوات، ماسٹر گل خیل، سرگزشت سوات، وادی چترال، ہیون سانگ، فاہیان، راویان سربیٹ پیشو، ڈاکٹر لوکا، سرآرل سٹائن۔

farhadalikhwar@gmail.com

بریکوٹ میں دریافت شدہ آثار جنہیں "غنڈئی" کے آثار قدیمہ کہا جاتا ہے

موجودہ بریکوٹ کا ایک دلکش نظارہ

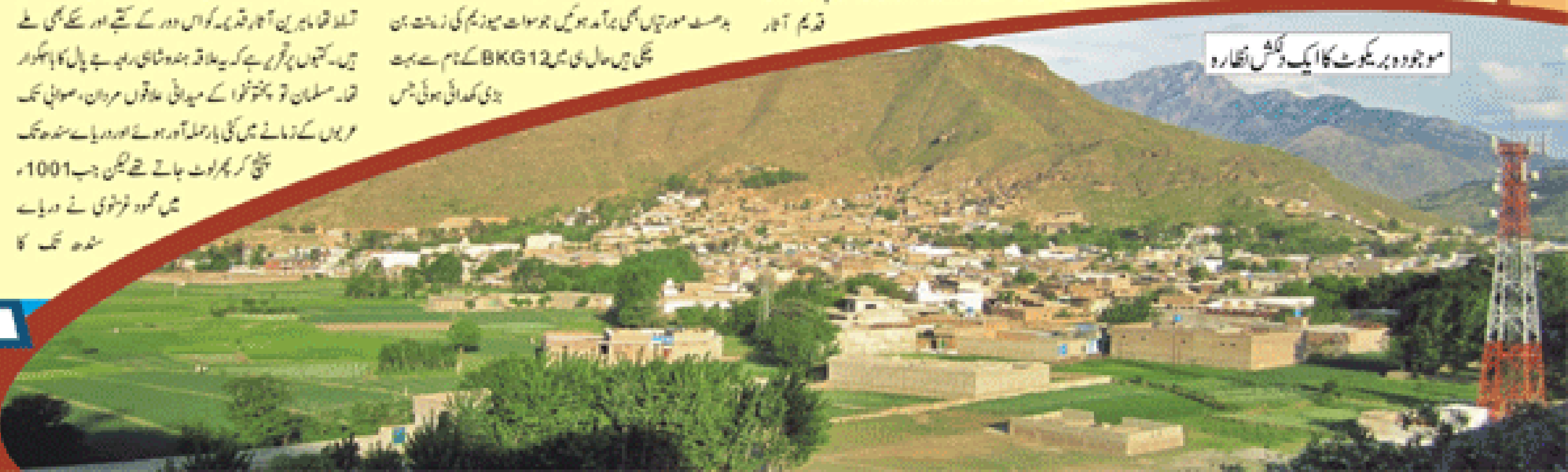

بلاعنوان

سانحہ پشاور کے حوالے سے میڈیا وسوشل پر ملکی وغیر ملکی رہنماؤں مشہور شخصیات کے بیانات' ٹویٹر اور تاثرات ہم پڑھتے آرہے ہیں ذیل میں عام آدمی کے اس سانحے پر کیا تاثرات ہیں اس کا ایک اندازہ سوشل میڈیا پر کی گئیں ان پوسٹوں سے لگایا جاسکتا ہے ان میں کم پڑھے لکھے لوگوں سے لے کر اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کی بھی آرا شامل ہیں۔

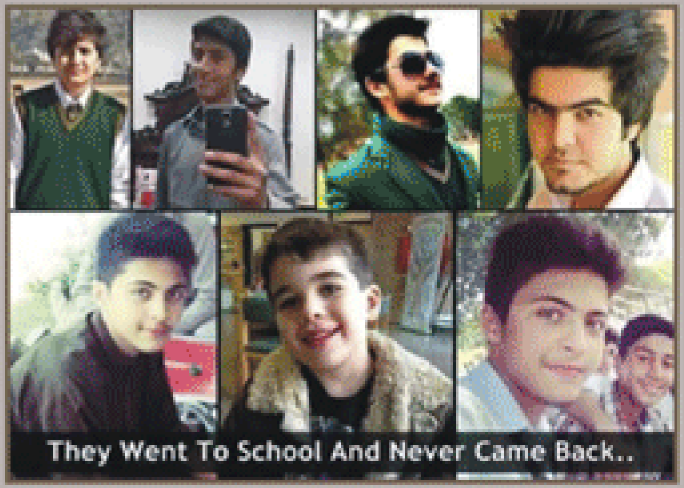

تعزیت گالی..........سوگ طعنہ لگ رہا ہے......کوئی لفظ......کوئی پرسہ......ان زخموں کا مداوا نہیں......کوئی سزا اس جرم کے شایان نہیں......کوئی حیلہ......کوئی بہانہ......اس غفلت کا جواز مہیا نہیں کرسکتا......دعا بے معنی......بد دعا مہمل سی ہوگئی ہے......اقدامات ملعون لگ رہے ہیں......بیانات غلیظ بول و براز کا ڈھیر......کوئی گنتی بھی پوری نہیں بتا رہا......کیسے تیار ہو کر گئے ہوں گے......لنچ بکس سے کیا کھایا کیا چھوڑا کس سے پوچھوں......

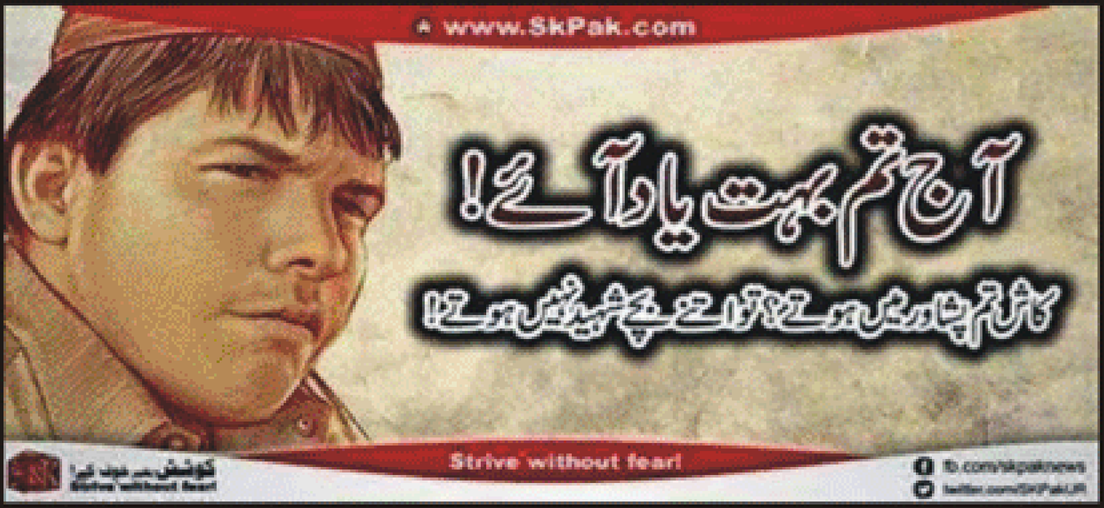

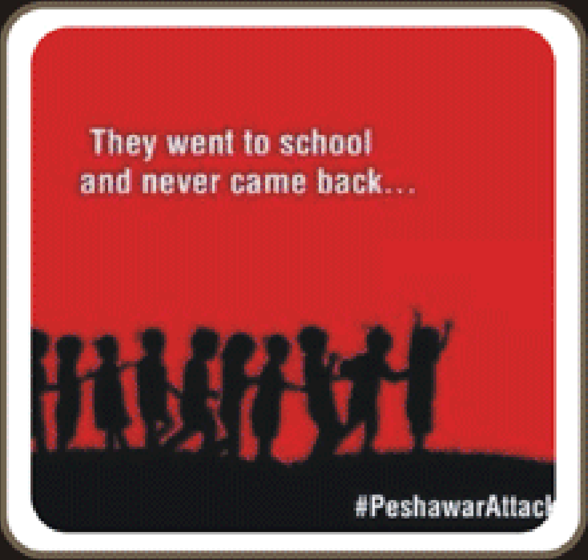

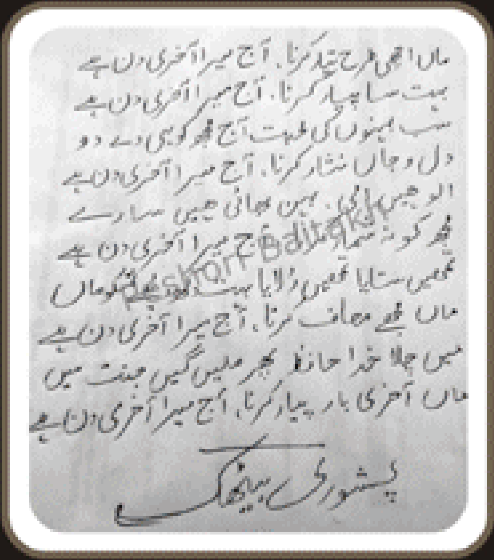

روشن مستقبل چاہیے محفوظ ماحول میں کوئی بھی مجھے بتا سکتے ہے کون سے سکول میں مجھے اپنے بچے کو داخل کرنا چاہیے؟ ایک باپ کا سوال۔ جناب وزیر اعظم' صدر مملکت' چیف آف آرمی سٹاف' چیف جسٹس چاروں صوبوں کے وزرائے اعلیٰ و گورنرز' ڈی جی آئی ایس آئی اور تمام متعلقہ حکام جناب عالی! بہت ہو چکا اب..........؟

اس پانچ سالہ ماں سے کوئی کیسے تعزیت کرے جس نے اپنا گڑیا کو بڑی چاہ سے بھیجا تھا اس کا سکول میں پہلا دن تھا

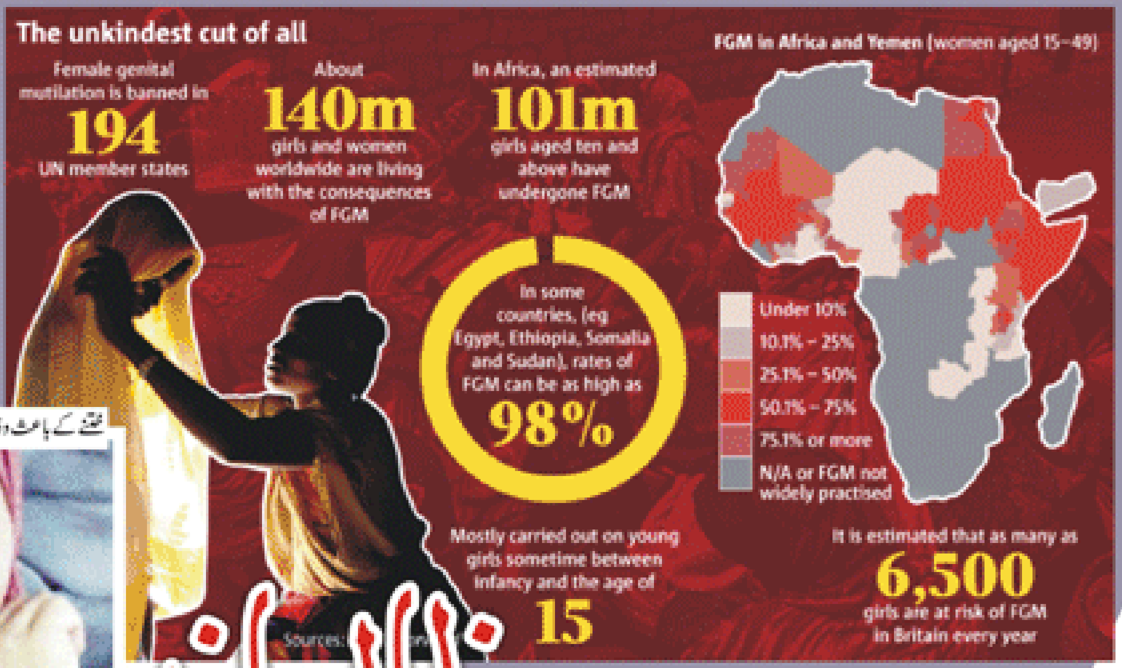

ختنے کے باعث وفات پانے والی سوہیر الباطیع

ظالمانہ رسم

دنیا بھر کی لاکھوں خواتین کا تطہیر نفس کے نام پر ختنہ کرایا جاتا ہے

ایس خان

مصر کے بعض علاقوں میں صدیوں سے خواتین کے ختنوں کی روایت موجود ہے حالانکہ مصری قوانین کے مطابق خواتین کے ختنوں پر پابندی بھی عائد ہے تاہم یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ حال ہی میں مصری عدالت نے تیرہ سالہ لڑکی کے ختنے جس سے اس لڑکی کی موت واقع ہوئی کے مقدمے میں نامزد ڈاکٹر رسلان فضل کو بری قرار دیا ہے۔ اس مقدمے کو مصری تاریخ میں اس لئے اہم قرار دیا جا رہا ہے کیونکہ اس میں قانون کی خلاف ورزی کی گئی تھی تاہم عدالت نے پھر بھی ملزم کو بے قصور قرار دے کر بری کر دیا۔ ڈاکٹر فضل مقامی آبادی میں اپنے فلاحی و خیراتی کاموں کی بدولت معزز مقام رکھتے ہیں اور نوجوان لڑکیوں کا اپنی فیملی کے ہمراہ ان کے آفس آنا جانا لگا رہتا ہے۔ ان کا آفس نیل ڈیلٹا نامی گاؤں میں قائم ہے جہاں مریضوں کے علاج معالجے کے علاوہ کئی لڑکیوں کے ختنے بھی کئے جاتے ہیں۔ یہیں پر ہی ڈاکٹر فضل نے سوہیر الباطیع نامی لڑکی کا آپریشن بھی کیا تھا جس کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوئی۔ ڈاکٹر فضل کا آفس علاقے میں لڑکیوں کے ختنوں کے نام سے مشہور ہو چکا تھا جہاں وہ قانونی پابندی کے باوجود اندازاً 90 فیصد خواتین کو اس تکلیف سے دوچار کر چکے ہیں تاہم میڈیا کے سامنے وہ پھر بھی یہ سب تسلیم کرنے سے انکاری ہیں۔

خواتین کے ختنوں کو 2008ء میں علماء نے ناجائز اور ایک خطرناک عمل قرار دیا تھا۔ ان کے مطابق مذہب میں بھی خواتین کے ختنوں کا کوئی جواز موجود نہیں لہٰذا اس عمل کی بیخ کنی ہونی چاہئے۔ اقوام متحدہ کا کہنا ہے کہ لڑکیوں کے ختنوں میں معمولی کمی ہوئی تاہم یہ سلسلہ اب بھی بڑے پیمانے پر جاری ہے اور مصر میں پابندی کے باوجود خواتین کے ختنوں کی شرح باقی دنیا سے کہیں زیادہ ہے۔ اگرچہ خواتین کے ختنوں کی وجہ سے عالمی شہرت یافتہ مصری گاؤں ڈیرب حطاریس میں بھی ختنوں کے خلاف احتجاج اور اس پر پابندی لگانے کی صدائیں بلند ہونا شروع ہو گئی ہیں تاہم یہ صدائیں عوامی شعور اجاگر کرنے کے لئے ناکافی ثابت ہو رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سوہیر الباطیع کی موت کے بعد بھی نوجوان خواتین اور لڑکیاں قانونی پابندی کے باوجود ختنوں کو ترجیح دے رہی ہیں۔

سوہیر کی ایک دوست رشا محمد کہتی ہیں کہ آپریشن سے پہلے دل میں ایک خوف ضرور ہوتا ہے اور کوئی بھی آسانی آپریشن کے لئے جانا پسند نہیں کرتا تاہم انہوں نے سوہیر کی موت کو حادثاتی قرار دیا۔ رشا کے بقول سوہیر کی موت آپریشن سے نہیں ہوئی کیونکہ اس دن کئی دیگر لڑکیوں کے آپریشن بھی ہوئے تھے تاہم انہیں کچھ بھی نہیں ہوا اور وہ اب تک صحیح سلامت ہیں اس کے علاوہ سوہیر کی دادی اپنی پوتی کی موت کو تقدیر کا لکھا قرار دے کر اس کا الزام کسی کے سر نہیں تھوپنا چاہتی۔ ان کے بقول سوہیر کے ختنے کو ایک سال سے زائد کا عرصہ بیت چکا تھا اور وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو چکی تھی لہٰذا آپریشن کو اس کی موت کی وجہ قرار دینا ناانصافی ہے۔ ایک مقامی مزدور کار عماد حامدی بھی اپنی بیٹی کا ختنہ کرانا چاہتے ہیں اور جواز کے طور پر وہ ختنہ کرنے کو بیٹی کے اخلاق میں بگاڑ کی وجہ سمجھتے ہیں جس کے لئے مقامی سطح پر تطہیر نفس کی اصطلاح استعمال کی جا رہی ہے۔

دنیا بھر کے 29 ممالک میں لڑکیوں کے ختنوں کا رواج ہے جن میں زیادہ تعداد افریقی ممالک کی بتائی جاتی ہے جبکہ مصر کے علاوہ عراق اور یمن کے بعض حصوں میں بھی خواتین کا ختنہ ضروری سمجھا جاتا ہے اور اس کے لئے کئی جواز اور معاشرتی وجوہ بھی پائی جاتی ہے مثلاً بغیر ختنہ کے لڑکی کو شادی کے قابل نہیں جانا جاتا یا بالفاظ دیگر جس لڑکی کا ختنہ نہ ہوا ہو اسے شادی کے لئے ناموزوں سمجھا جاتا ہے اور دوسری وجہ ختنہ کو تطہیر نفس کا ذریعہ قرار دیا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ یہ رسم ان ممالک میں بسنے والے مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں میں یکساں طور پر مقبول ہے اور دونوں ہی ختنے کو لڑکی کی اخلاقی پاکی کے لئے موزوں سمجھتے ہیں جبکہ انسانی حقوق کی تنظیمیں اس رسم کو لڑکیوں کی جنسی خواہشات دبانے اور خواتین کو جسمانی اور نفسیاتی اذیت دینا قرار دیتی ہیں۔

یہاں یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ قانونی پابندی کے باوجود اگر یہ رسم یوں ہی جاری و ساری ہے تو پھر اس طرح کے کیس عدالتوں میں کیوں نہیں آتے کیونکہ بہرحال یہ ایک غیر قانونی عمل ہے۔ اس کی وجہ شاید مقامی اور معاشرتی سطح پر خواتین کے ختنے کے وہ جواز ہو سکتے ہیں جو لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہیں۔ ایک وکیل رضا الدین بتوکی کا کہنا ہے کہ شاید یہی وجہ ہے کہ سوہیر کی فیملی نے پولیس میں رپورٹ تو کروائی تاہم ڈاکٹر سے مصالحتی مشورے کے بعد انہوں نے اپنا بیان تبدیل کر دیا جس کے لئے عدالت نے اس کیس کو خارج کر کے ملزم کو بری کرنے کے احکامات جاری کر دیئے۔

2008ء میں کی جانے والی سروے رپورٹ کے مطابق 15 تا 49 سال کی 91 فیصد خواتین ختنے کے عمل سے گزر چکی تھیں جبکہ 15 تا 17 سال کی عمر کی لڑکیوں کی شرح 74 فیصد تک تھی۔ اس سروے میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ خواتین کے ختنوں میں معمولی کمی واقع ہوئی ہے تاہم اس کی روک تھام کے لئے مقامی آبادی میں شعور اجاگر کرنے کی ضرورت ہے تب ہی اس ناجائز اور غیر اخلاقی عمل پر قابو پانا ممکن ہو سکتا ہے اس ضمن میں یونیسف کی ایک پائلٹ آرگنائزیشن کی سربراہ منال فاؤزے کا کہنا ہے کہ ملزم ڈاکٹر کو سزا دینی چاہئے تھی تاہم ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ تاہم ہم نے لوگوں میں شعور اجاگر کرنے کے لئے ایک گروپ بھی قائم کیا ہے۔ منال کا کہنا ہے کہ جب میں عام لوگوں کو خواتین کے ختنوں کے خلاف آواز بلند کرتے دیکھتی ہوں تو میں انتہائی خوشی محسوس کرتی ہوں جبکہ ہمارے گروپ نے مذہبی رہنماؤں اور ڈاکٹروں کو بھی اس ضمن میں اپنا کردار ادا کرنے کے لئے کہا ہے۔ منال کے بقول گو کہ یہ ایک حساس معاملہ ہے تاہم اس کے بغیر اس کا خاتمہ ممکن نہیں ہے۔

صوفہ نامی علاقے میں بھی ختنے کے عمل سے گزرنے والی بے شمار خواتین موجود ہیں جن کا کہنا ہے کہ آپریشن سے پہلے مریض کو کسی بھی قسم کی بے ہوشی والی دوا نہیں دی جاتی بلکہ اس کے بغیر ہی آپریشن کر دیا جاتا ہے جو کہ انتہائی تکلیف دہ ہوتا ہے۔ 40 سالہ خاتون اواطف محمد سالم کا کہنا ہے کہ میرا آپریشن بھی بچپن میں کیا گیا تھا۔ ایک مقامی خاتون حمدہ الخفاجی کا کہنا ہے کہ میری سات بیٹیاں ہیں جن میں سے ایک کا ختنہ ہوا ہے تاہم فاؤزے آرگنائزیشن کی آگاہی مہم کی بدولت میں نے اپنی باقی بیٹیوں کے ختنوں کا ارادہ ترک کر لیا ہے اور میرا اپنے ہمسایوں اور دوسرے لوگوں کو بھی یہی کہنا ہے کہ لڑکیوں کا ختنہ کرنا ایک غلط عمل ہے اس بارے ایک مقامی معمر خاتون احسان عدل وانی جس کی عمر اس وقت 75 سال ہے اور جو مقامی سطح پر مڈوائف کی ذمہ داری نبھاتی تھی ان ذمہ داریوں میں بچپن میں ہی مقامی لڑکیوں کا ختنہ بھی شامل ہوتا تھا کا کہنا ہے کہ میں نے شروع شروع میں بہت سی لڑکیوں کے ختنے کئے تاہم سات برس پہلے میری ملاقات ایک ڈاکٹر سے ہوئی جس نے مجھے سمجھایا کہ یہ تم جو کچھ کرتی ہو یہ غلط ہے تب سے اب تک میں نے کسی بھی لڑکی کا ختنہ نہیں کیا ہے۔ عدیل وانی کا مزید کہنا ہے کہ میں نے 20 سال کی عمر میں ہی یہ کام شروع کیا تھا اور یہ سب میں نے اپنی ماں سے سیکھا تھا۔ اس زمانے میں اپنی بیٹیوں کا ختنہ ماں کی ذمہ داری سمجھی جاتی تھی کیونکہ اس وقت مڈوائف کا تصور اتنا عام نہیں تھا تاہم بعد میں اس عمل نے ایک روزگار کی شکل اختیار کر لی اور لاتعداد مڈوائف اور عام خواتین اس روزگار سے وابستہ ہو گئیں۔ عدیل وانی اپنے متعلق بتاتی ہیں کہ میرے چار بیٹے اور ایک بیٹی ہے بیٹی کا ختنہ میں نے اپنے ہاتھوں سے کیا تھا جس پر مجھے سخت افسوس ہے اور جن لڑکیوں کے ختنے بھی میرے ہاتھ سے ہوئے ان پر بھی خود کو ملامت کرتی ہوں اور اب خواتین اور لڑکیوں کے ختنوں کے خلاف اور لوگوں میں اس کے خلاف شعور اجاگر کرنا میں اپنی ذمہ داری سمجھتی ہوں۔

اسٹیمیریا کے علاقے میں پانچ سال کی عمر میں زبردستی ختنہ کے عمل سے گزاری جانے والی 55 سالہ مقامی خاتون بدریا الغندی کا کہنا ہے کہ میرے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں جن میں سے میں نے صرف ایک بیٹی کا ختنہ کیا تھا تاہم یہ آگاہی مہم کا نتیجہ ہے کہ میں نے اپنی دوسری بیٹی کے ختنے کا فیصلہ واپس لے لیا اگر میں بروقت آگاہ نہ ہوئی ہوتی تو شاید دوسری بیٹی کو بھی اس تکلیف دہ عمل سے گزرنا پڑتا۔ ایک عیسائی خاتون سمیعہ جس کی عمر اب 35 سال ہے اپنے زبردستی ختنے کے بارے میں کہتی ہے کہ اس وقت میں بہت چھوٹی تھی جب میں نے مڈوائف کو اپنے گھر کے اندر آتے دیکھا تو میں چیخنے لگی تاہم میری امی نے آخر کار مجھے قابو کر کے زمین پر لٹا دیا اور زبردستی میرا آپریشن کر دیا گیا۔ 37 سالہ لیلیٰ ناظم بھی اپنے زبردستی ختنے کے بارے میں کہتی ہے کہ میں اس وقت بارہ سال کی تھی جب مجھے اس تکلیف دہ عمل سے گزارا گیا درحقیقت وہ میری زندگی کا ایک قیامت خیز دن تھا اس دن میری امی نے مجھے کہا کہ چلو چلتے ہیں تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ کہاں چلنا ہے تاہم مجھ پر ایک عجیب سا خوف طاری ہونے لگا اور آپریشن کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا جیسا مجھے مجروح کر دیا گیا ہو۔

ایک مسلمان خاتون بسریٰ حسن کا اپنے بارے کہنا ہے کہ میرا ختنہ تو مادی عمر میں کیا گیا تھا یہ مجھے اس وقت معلوم ہوا جب میں نے مڈوائف سے اپنے ختنے کی کہانی دریافت کرنا چاہی تو اول تو اس نے بتانے سے انکار کر دیا تاہم میرے اصرار پر اس نے سارا قصہ بیان کر دیا۔ جسے سن کر مجھے انتہائی غصہ بھی آیا تاہم خود کو قابو کر لیا تاہم اس کا مجھ پر اتنا گہرا اثر ضرور ہوا کہ میں نے اپنی دونوں بیٹیوں کا ختنہ کرنے سے انکار کر دیا جس وہ بیٹیوں اور دو بیٹوں کی ماں ہے اور اس وقت وہ لڑکیوں کے ختنوں کے خلاف آگاہی مہم میں بڑھ چڑھ کر شریک ہیں۔

21 ممالک میں یہ رسم بدجاری ہے

لڑکیوں کے ختنہ رسم براعظم افریقہ کے ستائیس ممالک کے علاوہ یمن، عراقی کردوں، مشرق وسطیٰ اور دنیا بھر کی اپنے علاقوں کو چھوڑ کر کہیں اور آباد ہونے والی برادریوں میں بھی پائی جاتی ہے یہ پیدائش سے لے کر سن شباب تک پہنچتے ہوئے یہ رسم کسی بھی وقت ادا کی جاتی ہے۔ محولہ بالا ممالک میں سے نصف جن کا قومی سطح پر ریکارڈ بھی دستیاب ہے میں بچیوں کی 5 سال عمر سے قبل ہی ان کا ختنہ کروا دیا جاتا ہے 21 ممالک جہاں اس رسم پر سختی کے ساتھ عمل کیا جاتا ہے کی تقریباً 133 ملین سے زائد خواتین اور لڑکیاں اس تجربے سے گزر چکی ہیں جبکہ زیادہ تر اریٹیریا، صومالیہ، سوڈان اور جبوتی میں رسم کے مطابق آٹھ ملین سے زائد خواتین کے ساتھ ایسا عمل کیا گیا ہے اگرچہ بہت سے ممالک جہاں یہ قبیح رسم ادا کی جاتی ہے میں اسے غیر قانونی قرار دیتے ہوئے اس پر پابندی لگائی گئی ہے تاہم اس کے سدباب کیلئے وضع کئے گئے قوانین پر سختی سے عملدرآمد یقینی نہیں بنایا جاتا۔ 1970ء سے اس رسم کو ادا کرنے والی اقوام، برادریوں میں انہیں ایسا نہ کرنے پر آمادہ کرنے کی کوششیں شروع کی گئیں اور 2012ء میں اقوام متحدہ نے اسے انسانی حقوق کی خلاف ورزی قرار دیتے ہوئے ان کوششوں کو شدید اور موثر کرنے کیلئے متفقہ قرارداد منظور کی۔

غریبوں کا بادام مونگ پھلی

میگزین ڈیسک

سردیوں میں سورج غروب ہوتے ہی فضا میں ٹن ٹن کی مخصوص آواز گونجتی ہے اور اس کے ساتھ ہی مٹی میں بھنی جانے والی مونگ پھلی کی مہک ہمیں اپنی جانب کھینچنے لگتی ہے یہ سچ ہے کہ سردی کے موسم میں گرما گرم مونگ پھلی کھانے کا اپنا مزہ ہے اسے دیکھ کر کھائے بنا رہا نہیں جا سکتا اور کیوں نہ کھائیں؟ یہ صحت کے لئے انتہائی مفید بھی تو ہے۔

مونگ پھلی ایک پھل دار پودا ہے لیکن غذائیت کی وجہ سے اسے خشک میووں میں شمار کیا جاتا ہے مونگ پھلی چکنائی سے بھرپور ہوتی ہے اسی وجہ سے اس کا تیل بھی نکالا جاتا ہے مونگ پھلی کو مختلف ڈشز روٹیوں "بن کیک" میٹھوں اور سوپ سمیت کئی دیگر کھانوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

مونگ پھلی کو غریبوں کا بادام کہا جاتا ہے اپنے گوناں گوں فوائد کی وجہ سے اسے مکمل خوراک قرار دیا جاتا ہے اس میں 28 فیصد تک لحمیات پائے جاتے ہیں جب کہ اس میں فیٹ تھیامائن "نیاسن" فولاد، وٹامن ای ڈی کے اور بی 6 فولیٹ "کیلشیم" جست اور مفید غیر تکسیدی اجزا پائے جاتے ہیں۔

مونگ پھلی میں پائے جانے والے غیر تکسیدی اجزا غذائیت کے اعتبار سے سیب، چقندر اور گاجر سے زیادہ طاقتور ہوتے ہیں یہ غیر تکسیدی اجزا نہ صرف جلد کی شگفتگی دور کرتے ہیں بلکہ ہونٹوں کو گلابی کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اس کا وٹامن ڈی ہڈیوں اور دانت مضبوط بنا کر کئی بیماریوں سے دور رکھتا ہے مونگ پھلی میں موجود وٹامن سی سرطان کے خلاف لڑنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔ قدرتی فولاد خون کے نئے خلیات بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ 100 گرام کچی مونگ پھلی میں ایک گلاس دودھ کے برابر لحمیات ہوتے ہیں اس میں حیاتین کی مقدار گوشت کے مقابلے میں 1.3 گنا زیادہ ہوتی ہے مونگ پھلی عمل انہضام صلاحیت بڑھانے میں کارگر ہے یہ معدے اور پھیپھڑوں کو طاقت دیتی ہے مونگ پھلی کے تیل کی خصوصیات آلو کے تیل سے کسی صورت کم نہیں ہیں۔ روزانہ تھوڑی مقدار میں مونگ پھلی کھانے سے نہ صرف دبلے پتلے لوگوں کا وزن بڑھنے لگتا ہے بلکہ یہ کسرت کرنے والے کے لئے انتہائی غذائیت بخش ثابت ہوتی ہے۔

کینیڈا میں کی جانے والی ایک جدید تحقیق کہتی ہے کہ ذیابیطس کے مریضوں کے لئے مونگ پھلی کا استعمال نہایت مفید ہے ماہرین کے مطابق ذیابیطس میں مبتلا افراد کے لئے روزانہ ایک مٹھی مونگ پھلی کا استعمال مثبت نتائج مرتب کرسکتا ہے ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ مونگ پھلی کا استعمال انسولین استعمال کرنے والے افراد کے خون میں انسولین کی سطح برقرار رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

امریکی سائنسدانوں کا مشورہ ہے کہ مونگ پھلی کے شوقین اگر اسے کچی، بھنی ہوئی یا تلی ہوئی شکل میں کھانے کے بجائے ابال کر کھائیں تو اس سے جسم کو ایسے مفید صحت کیمیائی مادے چار گنا مقدار تک حاصل ہوں گے جو بیماری سے مدافعت میں مدد دیتے ہیں تاہم مونگ پھلی کو بہت زیادہ پکانے یا گرمی پہنچانے سے اسکے مفید صحت کیمیائی مادے ضائع ہو جاتے ہیں۔ طبی ماہرین ماں بننے والی خواتین کو حمل کے دوران بہت زیادہ مونگ پھلیاں کھانے سے منع کرتے ہیں کیونکہ دوران حمل بہت زیادہ مونگ پھلیاں کھانے والی ماؤں کے بچوں کے اندر ان بچوں کے مقابلے میں مونگ پھلی کی الرجی کے امکانات 3 گنا ہوتے ہیں جن کی مائیں دوران حمل کے دوران مونگ پھلی نہیں کھاتیں۔

چوری اور سینہ زوری

سڑکوں پر چوری کی گاڑیوں کا راج ہر طرح کے جرائم میں استعمال ہو رہی ہیں

ارسلان خان

ہم سب نے ٹی وی اور اگلے روز اخبارات میں یہ خبر دیکھی کہ آرمی پبلک سکول اینڈ کالج ورسک روڈ پر حملہ کرنے والے دہشت گرد ایک سوزوکی کیری وین میں بیٹھ کر آئے اور سکول میں داخل ہونے سے پہلے انہوں نے اپنی گاڑی کو آگ لگا دی جس کے بعد انہوں نے سکول میں گھس کر معصوم بچوں کے خون سے کئی گھنٹے تک ہاتھ رنگے تاہم اس خبر کو پڑھنے کے بعد تقریباً ہم سب نے اسے مکمل طور پر بھلا دیا۔ شاید چند روز کے بعد اخبارات میں ایک اور خبر چھپے کہ اس گاڑی کو اسلام آباد یا راولپنڈی سے فلاں تاریخ کو چرایا گیا تھا اور چونکہ پاکستان کی تاریخ کی اس سب سے زیادہ خونی دہشت گردی کی واردات میں چوری کی گاڑی کا استعمال کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس سے قبل بھی پشاور میں ہونے والے قصہ خوانی دھماکے سے لیکر پیپل منڈی دھماکے تک ہر واقعہ تحقیق کے عمل میں اس وجہ سے الجھاؤ کا شکار ہو جاتا ہے کیونکہ ان تمام واقعات میں چوری کی گاڑیاں استعمال ہوئیں۔

اس وقت پاکستان میں کار لفٹنگ ایک باقاعدہ منظم اور منافع بخش کاروبار بن چکا ہے ہر سال پاکستان بھر میں لاکھوں گاڑیاں سرقہ ہوتی ہیں جن میں سے بعض کو پرزوں میں تبدیل کر کے ملک کی سپیئر پارٹس کی مارکیٹوں میں فروخت کر دیا جاتا ہے اور اچھی کنڈیشن کی گاڑیوں کو جعلی رجسٹریشن بنا کر پشاور، خیبر ایجنسی، مردان وغیرہ میں قائم بارگینوں کے ذریعے مارکیٹ میں فروخت کر دیا جاتا ہے۔ اس وقت صورتحال یہ ہے کہ خیبر پختونخوا سے چرائی جانے والی گاڑیوں کو پنجاب اور سندھ اور سندھ و پنجاب سے چرائی جانے والی گاڑیاں خیبر پختونخوا اور فاٹا پہنچائی جاتی ہیں۔ فاٹا میں جو لوگ نان کسٹم پیڈ اور چوری کی گاڑیوں کا کاروبار کرتے ہیں وہ ایسا چوری چھپے نہیں بلکہ ڈنکے کی چوٹ پر کرتے ہیں کیونکہ فاٹا پاکستان کا ایسا علاقہ ہے جہاں پر کسی بھی کاروبار کو غیر قانونی نہیں سمجھا جاتا ہے چاہے وہ منشیات کی خرید و فروخت ہو اغوا برائے تاوان کا مکروہ دھندہ ہو سمگلنگ ہو یا پھر چوری ڈکیتی کی وارداتیں ہوں۔

ایک زمانہ تھا کہ درہ آدم خیل اور خیبر ایجنسی میں پشاور سے سرقہ ہونے والی گاڑیوں کو "کرایہ" پر لیکر ان کے مالکان کو واپس کرنے کا دھندہ عروج پر تھا۔ عسکریت پسندی کے شروع ہوتے ہی یہ لوگ تو روپوش ہو گئے لیکن چوری کی گاڑیوں کا دھندہ کبھی ختم نہیں ہو سکا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک بہت منافع بخش کاروبار ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس سال صوبے میں کار چوری کی 217 وارداتیں ہوئیں صوبے میں 333 موٹر سائیکلیں چوری جبکہ 139 بندوق کی نوک پر چھینی گئیں یہ وہ اعداد و شمار ہیں جس میں ایف آئی آر کا اندراج ہوا اور یہ کوئی راز کی بات نہیں ہے کہ 80 فیصد گاڑی چوری کی واقعات میں ایف آئی آر درج نہیں ہوتی ہیں اس لئے اس کوئی اعداد و شمار نہیں کیا جا سکتا لیکن پولیس کے ان اعداد و شمار سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ 2014 میں کار لفٹنگ اور کار چھیننے کے واقعات میں 2013 کی نسبت اضافہ ہوا چوری اور نان کسٹم پیڈ گاڑیاں اغوا برائے تاوان "عملیات" کی سمگلنگ اور سب سے بڑھ کر دہشت گردی کے واقعات میں کھلے عام استعمال ہو رہی

جرائم سمگلنگ اور اغوا برائے تاوان کی وارداتوں سے اربوں روپے کماتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ نظام کی تبدیلی کے سب سے بڑے مخالف ہیں۔ اب شاید وقت آ گیا ہے کہ پاکستان کی بقاء کی خاطر ایک بہتر تبدیلی کی طرف قدم اٹھایا جائے اور اس سلسلے میں پہلا قدم یہ ہو گا کہ فاٹا کو بندوبستی علاقہ بنایا جائے دوسری طرف اس بات کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اگر 60 فیصد جرائم فاٹا کی وجہ سے ہیں تو 40 فیصد کا مرکز خیبر پختونخوا کا بندوبستی علاقہ ہے۔ پنجاب اور سندھ سے چرائے جانے والی گاڑیوں کو بڑے منظم انداز میں خیبر پختونخوا پہنچایا جاتا ہے جہاں چند گروہوں کو چیسس نمبر تبدیل کرنے میں مہارت حاصل ہے جب چیسس نمبر تبدیل کر لئے جاتے ہیں تو جعلی کاغذات بنا کر یہاں پر دوسری گاڑیوں کے نمبر لگا کر ان کو مارکیٹ میں فروخت کر دیا جاتا ہے اور یہ سب کچھ

کو عوام کی سہولت کے لئے آن لائن گاڑیوں کے کاغذات چیک کرنے کی سہولت شروع کرنی چاہئے تاکہ لوگ گاڑی خریدنے سے پہلے یہ دیکھ سکیں کہ اس کے خلاف ملک بھر میں کہیں پر کوئی ایف آئی آر تو نہیں درج۔ بدقسمتی سے گاڑیاں چھیننے کی وارداتوں میں 60 فیصد ملوث لوگ افغانی اور 40 فیصد خیبر پختونخوا کے باشندے ہیں اور ایسے لوگوں کا پولیس کو اچھا خاصا پتہ بھی ہے لیکن اس کے باوجود ان کے خلاف کریک ڈاؤن سے گریز کیا جاتا ہے گاڑیوں کے انجن نمبر تبدیل کر کے انہیں جعلی کاغذات کے ذریعے فروخت کرنے والے بارگین مالکان کے خلاف موثر کارروائی کی ضرورت ہے جب تک ایسا نہیں کیا جاتا ہر قسم کی جرائم میں چوری کی گاڑیاں استعمال ہوتی رہیں گی اور ایسے مجرموں کو پکڑنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہی ہوگا۔

نمبر پلیٹ کا حصول بہت آسان

تھا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان قوانین کی رو سے فاٹا میں ہر غیر اخلاقی اور غیر قانونی چیز کو قانونی حیثیت حاصل ہے کو اب مکمل طور پر ختم کیا جائے اور ان علاقوں کی "غیر بندوبستی" حیثیت کو ختم کرنے کا پکا اور مکمل بندوبست کیا جائے اس کی مخالفت میں سرفہرست قبائلی ملکان کا وہ مراعات یافتہ طبقہ تھا جس کا مفاد ہی فاٹا کے قوانین پر یا ہونے میں تھا کیونکہ حکومت ان کے ذریعے علاقے کو کنٹرول کرنے پر مجبور تھی۔ طالبان کے ظہور کے بعد یہ قبائلی ملک سینکڑوں کی تعداد میں ٹارگٹ کلنگ کا شکار ہو چکے ہیں اور اگر حکومت اب بھی ماضی کی غلطیوں سے سبق نہیں سیکھتی تو ایک بار پھر ایک مراعات یافتہ طبقہ پیدا کر کے ان کے ذریعے ان علاقوں کو چلانے کی کوشش کرتی ہے تو یہ اس خطے کے عوام اور پورے ملک کے ساتھ ایک بہت بڑی دشمنی ہوگی کیونکہ لاکھوں کروڑوں روپے کے فنڈ ان قبائلی ملکان پر خرچ ہوتے ہیں اور نچلی سطح پر ایک عام آدمی تک نہیں پہنچ پاتے۔ ملکان پر اس رقم کو خرچ کرنے کی بجائے اگر ان کو سڑکوں، سکولوں اور ہسپتالوں کی تعمیر پر خرچ کیا جائے تو اس سے ایک عام آدمی کو فائدہ پہنچے گا لوگوں میں جرائم کی طرف راغب ہونے کا رجحان اس وجہ سے بھی زیادہ ہے کیونکہ یہاں پر تعلیم حاصل کرنے کے مواقع نہ ہونے کے برابر ہیں اور مقامی طور پر لوگوں کو باعزت روزگار بھی میسر نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ نوجوان نسل بے روزگاری سے تنگ آ کر جرائم کی راہ پر چل پڑتی ہے۔ بدقسمتی سے یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ فاٹا کی انتظامیہ میں موجود لوگ

پشاور اور بندوبستی علاقوں میں موجود سینکڑوں بارگین مالکان کی ملی بھگت کے بغیر سرے سے ناممکن ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ پولیس کی سطح پر بھی گاڑی چوری کی ایف آئی آر کے اندراج کو موثر اور یقینی بنایا جائے کیونکہ جب چوری ہونے والی گاڑی کی ایف آئی آر پولیس درج نہیں کرتی تو اس کا فائدہ ان لوگوں کو ہوتا ہے جو یہ گاڑیاں سرقہ کرتے ہیں ایسی گاڑیوں کو آگے فروخت کرنا آسان ہوتا ہے کیونکہ ان کو پولیس پکڑ ہی نہیں سکتی ہے۔ خیبر پختونخوا پولیس

بڑے شہروں میں سرعام پارک کی جاتی ہیں

فاٹا میں چوری کی گاڑی کی خریداری بہت آسان

سانحہ پشاور گاڑی اسلام آباد کی

اسلام آباد پولیس نے سانحہ پشاور میں استعمال ہونے والی گاڑی کے مالک کو گرفتار کر لیا ہے اب اس سے پوچھ گچھ کر رہی ہے کہ اس کا دہشت گردوں سے کوئی تعلق تو نہیں۔ آئی جی پولیس طاہر عالم خان نے بھی تصدیق کی ہے کہ مشتبہ شخص گرفتار ہوا ہے۔ ذرائع کے مطابق انٹیلی جنس اداروں نے گاڑی کا رجسٹریشن نمبر (NS-187) اسلام آباد پولیس کو دیا تھا جس نے ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن آفس کی مدد سے گاڑی کے مالک کا پتہ معلوم کیا گاڑی کے مالک کا تعلق اسلام آباد کے جی سیون فری سیکٹر سے ہے تاہم جب پولیس نے اس پتے پر ایک مکان پر چھاپہ مارا تو یہاں اصل مالک کا ایک رشتہ دار مقیم تھا جس نے بعد میں پولیس کی مشتبہ شخص کی گرفتاری میں مدد بھی کی۔ بعض ذرائع کا کہنا ہے کہ مشتبہ شخص ایک سرکاری ملازم ہے تاہم پولیس نے اس کی تردید یا تصدیق نہیں کی۔ چند ذرائع کے مطابق مشتبہ شخص اور اس کا بیٹا ٹریول ایجنسی چلاتے ہیں جس کا آفس پشاور میں یونیورسٹی روڈ پر ہے تحقیقات کے دوران معلوم ہوا کہ سانحہ پشاور میں استعمال ہونے والی گاڑی گزشتہ پانچ سال سے مشتبہ شخص کے استعمال میں تھی تاہم مشتبہ شخص نے گاڑی کے دہشت گردی میں استعمال سے متعلق لاعلمی ظاہر کرتے ہوئے بتایا کہ اس سے اس کے ایک رشتہ دار نے گاڑی مانگی تھی اس سلسلے میں مزید تحقیقات جاری ہیں۔

قدرت کا معجزہ ڈی این اے

ایک ننھا سا خلیہ اپنے اندر معلومات کا سمندر چھپائے ہوتا ہے

میگزین ڈیسک

ہماری تیزی سے اپنی کاپیاں تیار کرنے کی پراسرار صلاحیت تو اپنی جگہ لیکن ہمارے خلیے کے اندر قدرت کا سب سے بڑا معجزہ دراصل اس کا DNA ہے یا (Deoxyribo Nucleic Acid) کا مخفف ہے ماں اور باپ کے کروموسومز سے جو خلیہ وجود میں آتا ہے اس میں ڈی این اے ایک دوسرے پر لپٹی ہوئی دو ڈوریوں کی مانند ہوتا ہے بچے کے مستقبل کے لاتعداد امکانات ناقابل شمار اطلاعات معلومات اور پروگرام اسی ڈی این اے میں سٹور ہوتے ہیں اسی کی مدد سے ایک ننھا سا خلیہ اپنے اندر معلومات کا ایک سمندر چھپائے ہوتا ہے۔ ڈی این اے پر موجود معلومات کو اگر لفظوں کی شکل دے کر لکھا جائے تو کتابوں کی بڑی لائبریری وجود میں آسکتی ہے۔ بچے کے جسم کی تعمیر اور حیات سے قابل استعمال رکھنے کے لئے جس نقشے کی ضرورت ہوتی ہے وہ نقشہ ہر خلیے میں موجود ہوتا ہے اعضاء کی تیاری بناوٹ 'تعمیر' تھیسیب کارکردگی سرکی کوائف ہو سب تفصیلات پہلے ہی سے ہر خلیے کے ڈی این اے میں کوڈ کی شکل میں موجود ہوتی ہیں۔ مثلاً جسم کا سب سے اہم اور مرکزی کیمیکل پلانٹ جگر کس طرح ڈیزائن ہو گا کب مکمل ہو گا کب کام شروع کرے گا اس کی تعمیر کے لئے کس قسم کا خام مال درکار ہو گا۔ مال کہاں سے کس طرح درآمد کیا جائے گا یا پھر بچے کے بالوں اور آنکھوں کا رنگ کیسا ہو گا کون سے عضو کی تعمیر کا کام کب اور کس مقام پر روک دیا جائے گا بڑے ہونے کے بعد انسان کا مزاج کیسا ہو گا کونسی بیماریاں اسے پریشان کریں گی یا پھر بچے میں ماں 'باپ' دادا' دادی اور نانا نانی کی کون کون سی خصوصیات موجود ہوں گی وغیرہ وغیرہ۔

حیران کن بات یہ بھی ہے کہ ایک ننھا خلیہ جو مائیکروسکوپ کے بغیر نظر تک نہیں آتا کس قدر عظیم قوت اور صلاحیت رکھتا ہے کہ ایک خلیہ انسان کی تعمیر کرتا ہے دوسرا گوشت کی اور تیسرا مچھلی کی (وہ دودھ پلانے والے تمام حیوانوں کے خلیے ایک سے ہوتے ہیں) یہ معجزہ دراصل ڈی این اے کا مرہون منت ہوتا ہے اور خود ڈی این اے ۔۔۔ ڈی این اے دراصل خلیے کی پراسرار مملکت کا ڈکٹیٹر ہے یہ سخت گیر منتظم تمام خلیوں کو اپنے حکم پر چلاتا ہے ڈی این اے خلیوں کو ہدایات دیتا ہے کہ کس کو کیا کرنا ہے کیا بنانا ہے اس کے لئے کب کیا کہاں سے اور کس قدر حاصل کرنا ہے ڈی این اے کو آپ ایک آرکیٹیکٹ سے تشبیہ دے سکتے ہیں جس کا کام عمارت کی تعمیر سے پہلے اس کا نقشہ تیار کرنا ہوتا ہے یہ نقشہ بعد میں ٹھیکیدار کو دے دیا جاتا ہے جو عمارت تعمیر کرتا ہے۔ لیکن آرکیٹیکٹ تعمیر مکمل ہونے تک تعمیری کام کی نگرانی کرتا رہتا ہے۔

خلیے میں ٹھیکیدار کا کردار آر این اے یعنی Ribo Nucleic Acid انجام دیتا ہے تعمیر کے بارے میں تمام تفصیلات لاتعداد و بے شمار اطلاعات' ہدایات' مالیکیولز کی شکل میں ڈی این اے کی ڈوریوں پر "چھپی" ہوئی ہوتی ہیں۔ ڈی این اے انہیں اچھی طرح "پڑھتا" ہے اور ڈی این اے کی زیر نگرانی نقشے کے مطابق تعمیر کا ابتدائی کام شروع۔ سب سے پہلے وہ ایک پروٹین کی تیاری شروع کرتا ہے اس مقصد کے لئے اسے امائنو ایسڈ کے مختلف اجزاء کو جمع کرنا ہوتا ہے۔ آر این اے اجزاء کو لڑی کے موتیوں کی طرح پرونا شروع کر دیتا ہے اس طرح جو چیز وجود میں آئے گی ممکن ہے وہ انسان کے دل کی شریان ہو یا ممکن ہے اس سے انگشت شہادت کو حرکت دینے والا پٹھا بن جائے لیکن آر این اے کو وہی چیز بنانا ہوتی ہے جس کے بارے میں ڈی این اے نے ہدایات دی ہوں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ آپ کی آنکھ کے ساٹھ کروڑ چالیس لاکھ خلیوں میں سے ہر خلیے میں موجود ڈی این اے وہ تمام فنی معلومات اور ضروری صلاحیتیں رکھتا ہے جن کے ذریعے ایک مکمل انسانی بچہ وجود میں آسکتا ہے اسی طرح کان کے خلیوں میں یہ صلاحیت بھی موجود ہے کہ وہ کان کے بجائے پیٹ تعمیر کریں لیکن ہم خلیے کبھی ایسا نہیں کرتے صرف وہی کر سکتے ہیں جس کا انہیں "اوپر" سے حکم ملتا ہے ہم سب خلیے ہر آن مرا ... ہیں لیکن قدرت ہماری اضافی صلاحیتوں کو بلاک کر دیتی ہے میں اپنی طرح کی کروڑوں کاپیاں تیار کر سکتا ہوں اور بس! زندگی اور موت کا کھیل تو ساری کائنات میں جاری ہے اس سے ہم خلیوں کو بھی مفر نہیں ہے ہر سیکنڈ پر ہم سے لاکھوں خلیے اپنی زندگی پوری کر کے مر جاتے ہیں لیکن ان کے ساتھ ہی لاکھوں نئے خلیے پیدا ہو جاتے ہیں۔ "مردوں" کو ٹھکانے لگانے کا نظام ہر لمحے فعال رہتا ہے اگر یہ نظام کسی سبب سے کام کرنا چھوڑ دے تو جسم میں ہزاروں بیماریاں پیدا ہو جائیں گی۔ فیٹ سیل یعنی چکنائی کے خلیے ایک بڑے سٹور کی مانند ہوتے ہیں اور سست رفتاری کے ساتھ اپنی تعداد میں اضافہ کرتے ہیں جبکہ جلد کے خلیوں کی پیداوار انتہائی تیز رفتاری سے جاری رہتی ہے ہر دن گھٹنے کے اندر جلد کے پرانے خلیے' نئے خلیوں سے بدل جاتے ہیں اور ہر ستائیس دن کے بعد آپ کی کھال مکمل طور پر تبدیل ہو چکی ہوتی ہے۔ دماغ کے خلیے بہر حال ایک انفرادیت رکھتے ہیں دماغ کے اندر ابتداء ہی سے خلیوں کی اتنی وافر تعداد ہوتی ہے کہ تاحیات ان میں کسی اضافے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ دماغ کے خلیوں میں مرنے کا عمل تو جاری رہتا ہے لیکن نئے خلیوں کی پیداوار کا کوئی نظام نہیں ہوتا مرنے والے خلیوں کی جگہ خلیوں کی اضافی فوج سنبھالتی رہتی ہے۔

آیئے اب میں آپ کو اپنے صنعتی علاقے کی سیر کراؤں جہاں ماں کے پیٹ سے لے کر آپ کی آخری سانس تک چوبیس گھنٹے کام جاری رہتا ہے میرے اندر چھوٹے کیمیکل پلانٹ موجود ہیں جو انزائمز (Enzymes) یعنی خامرے کہلاتے ہیں یہ ایسے حیاتیاتی کیمیائی اجزاء ہیں جو تمام حیوانوں اور پودوں میں پائے جاتے ہیں اور خود تبدیل ہوئے بغیر بے شمار کیمیائی تبدیلیوں کا باعث بنتے ہیں۔ یہ ماہر کیمیا دان جسم کے ٹھیکیدار آر این اے کی ہدایت پر اپنا کام کرتے ہیں۔ مثلاً آپ نے مچھلی کا جو بھی ٹکڑا کھایا تو انزائمز اس سے پروٹین حاصل کرتے ہیں پھر وہ امائنو ایسڈ کی ترتیب بدل کر انہیں دوسری ترتیب میں منتقل کرتے ہیں ترتیب کی اس تبدیلی سے مچھلی کی پروٹین انسانی پروٹین یعنی مچھلی کا گوشت انسان کا گوشت بن جاتا ہے یہ ماہر کیمیا دان حتیٰ انسانی کو مشتعل کر دینے والے پراسرار ہارمون بھی تیار کرتے ہیں اور بیماریوں کے خلاف جسم کے دفاعی نظام میں بڑا اہم کردار رکھتی۔

بیماریوں کے خلاف لڑنے والی فوج' ظفر موج یعنی اینٹی باڈیز تیاری اور حالت جنگ میں "تازہ دم فوج" کی مسلسل فراہمی انہیں انزائمز کی ذمہ داری ہے اس کے علاوہ یہ انزائمز بے شمار ایسے محیر العقول کارنامے بھی انجام دیتے ہیں جن کے بارے میں دنیا کے عظیم کیمیا دان ابھی سوچ بھی نہیں سکتے۔ اب تک آپ نے میرے اندر کا ایک سرسری نظارہ کیا ہے آپ نے دیکھا کہ ایک ناقابل بصارت "ذرے" میں ایک دنیا آباد ہے آیئے اب میں آپ کو اپنی بیرونی ساخت دکھاؤں۔ میری بیرونی جھلی (Membrane) کو آپ شہری حفاظتی دیوار یا فصیل شہر کہہ سکتے ہیں اس حفاظتی دیوار کی موٹائی کا تصور کرنا خاصا مشکل ہے دراصل اس کی موٹائی 0000001 ملی میٹر ہوتی ہے یعنی ملی میٹر کا دس لاکھواں حصہ ابھی چند برس پہلے تک سائنس دان میری بیرونی جھلی کو پلاسٹک کی تھیلی سے تشبیہ دیا کرتے تھے ان کا خیال تھا کہ اس تھیلی کا واحد مقصد خلیے کے تمام اجزاء کو سمیٹے رکھنا ہے لیکن الیکٹران مائیکروسکوپ کی ایجاد کے بعد وہ اس قابل ہوئے کہ اس جھلی کی اہمیت اور افادیت کو کسی حد تک سمجھ سکیں۔

سائنس دانوں کو اب جا کے معلوم ہوا ہے کہ یہ جھلی صرف اندرونی اجزاء کو سنبھالے ہی نہیں رکھتی بلکہ یہ خلیے کے لئے بہت مستعد اور ذمہ دار سیکورٹی گارڈ کے فرائض بھی انجام دیتی ہے یہاں سیکورٹی اور چیک کا انتہائی "جدید" خود کار نظام کام کرتا ہے اسے معلوم ہے کہ کون سی چیز خلیے کے اندر جا سکتی ہے اور کس چیز کو خلیے سے باہر جانے کی اجازت ہے سوا ارب خلیوں میں سے کن خلیوں کو اس خلیے کے قریب آنے کی اجازت ہے اور کن سے اسے دور رہنا ہے یہ جھلی خلیے کے اندرونی ماحول کو کنٹرول کرتی ہے اسے معلوم ہے کہ خلیے کے اندر نمکیات' پروٹین' پانی' آکسیجن اور دوسرے حیاتیاتی اجزاء کا کیا تناسب برقرار رہتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے یہ جھلی بے حد اہم نوعیت کی خدمات انجام دیتی ہے یہ زندگی کی ضروریات کو اچھی طرح چیک کرنے کے بعد خلیے میں داخل ہونے کی اجازت دیتی ہے اور خام مال کے فضلے ہر لمحے خلیے سے باہر نکالتی رہتی ہے حقیقت تو یہ ہے کہ ہماری اور اس کے نتیجے میں آپ کی زندگی کا سارا دارومدار اسی سیکورٹی چیک پر منحصر ہے۔ سینکڑوں اقسام کے کھربوں خلیے باہمی چھوٹ کے علاقے میں جس نظم و ضبط کے ساتھ رہتے ہیں وہ شاید انسانی معاشروں کے لئے ایک مثال ہے مختلف اقسام' شکلوں اور رنگوں کے خلیے اپنی اپنی شناخت برقرار رکھتے ہوئے الگ الگ رہتے ہیں لیکن مجموعی طور پر انسانی وجود کی تعمیر کرتے ہیں اور تاحیات اسے برقرار رکھتے ہیں سب اپنے اپنے کاموں اور ذمہ داریوں کی انجام دہی میں مصروف رہتے ہیں دوسروں کے کام میں قطعی مداخلت نہیں کرتے اگر مختلف اقسام کے یہ خلیے حادثاتی طور پر ایک دوسرے کے کاموں میں دخل اندازی شروع کریں تو چند ہی لمحوں میں انسان کی موت واقع ہو سکتی ہے یا کم از کم اس کی شکل کسی بھیانک خلائی مخلوق کی صورت میں مسخ ہو سکتی ہے۔ اس بھیانک حادثے کے تدارک کے لئے قدرت نے مختلف اقسام کے خلیوں کو الگ الگ "شناختی کارڈ" جاری کئے ہیں ہر خلیے کے پاس ایک مخصوص ٹیگ ہوتا ہے ہر خلیے کا حفاظتی نظام اسی ٹیگ کے ذریعے کام کرتا ہے اگر وہ خلیہ اسی گروپ سے تعلق رکھتا ہے تو اسے قریب آنے کی اجازت دی جاتی ہے بصورت دیگر اسے فوراً ہی وہاں سے بھاگ جانے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ اگر اجنبی خلیوں کو دوسرے خلیوں کی آبادیوں میں داخل ہونے سے روکنے کا حفاظتی نظام کام کرنا بند کر دے تو ممکن ہے بالوں کے خلیے آنکھوں کے پردے میں داخل ہو جائیں اور آنکھوں کے اندر سے بال اگنا شروع ہو جائیں۔

"اور اگر ہم چاہیں تو ان کی آنکھوں پر جھاڑو پھیر دیں اور اگر ہم چاہیں تو جہاں یہ ہیں (وہیں) ان کی صورتیں بدل کر رکھ دیں" (سورہ یٰسین) یہ امکانات ہر وقت موجود ہوتے ہیں لیکن ہماری جھلی کا یہ حفاظتی نظام آپ کو تاحیات ان خطرات سے محفوظ رکھتا ہے ایک خیال یہ ہے کہ ہماری یہ جھلی ایک بے حد حساس مواصلاتی نظام بھی رکھتی ہے اور اس کے ذریعے اس کا دوسرے خلیوں سے رابطہ رہتا ہے یہ سسٹم کس طرح کام کرتا ہے اس کے بارے میں سائنس دان ابھی کچھ بتانے سے قاصر ہیں ایک خیال ہے کہ یہ سسٹم انزائمز کے ذریعے کام کرتا ہے لیکن ابھی صرف یہ ایک خیال ہی ہے۔ انزائمز کے محیر العقول کارناموں میں سے ایک حیرت انگیز کارنامہ ہارمونز کی تیاری بھی ہے ہارمونز کو آپ کیمیائی پیغام رساں یا "کیمیکل کوریئر" کہہ سکتے ہیں۔ یہ پیغام رساں دماغ کے احکامات کو برق رفتاری سے جسم کے طول و عرض میں پہنچانے کا کام کرتے ہیں۔ مثلاً آپ کے جسم میں بلڈ شوگر بڑھنا شروع ہوئی ہے تو آپ کا لبلبہ فوراً ہی انسولین نامی ہارمون کی پیداوار شروع کر دیتا ہے۔ یہ ہارمون اس پیغام کے ساتھ کہ شکر کے ذخائر کو جلانے کا کام تیز کر دیا جائے دوران خون میں شامل ہو جاتا ہے اور یہ ہنگامی پیغام سیکنڈوں کے اندر رگوں اور شریانوں کے ہزاروں میل لمبے جال سے گزر کر جسم کے کھرب ہا کھرب خلیوں تک پہنچ جاتا ہے۔ خلیے اپنے اندر موجود شکر کو تیزی سے جلانے لگتے ہیں اور جلد ہی خون میں شکر کا تناسب درست ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر آپ دانتوں سے کوئی سخت چیز چبا کر توڑنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس کے لئے اضافی توانائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس اضافی مانگ کو پورا کرنے کے لئے آپ کی گردن پر موجود "تھائی رائیڈ گلینڈ" ایک مخصوص کیمیائی کوریئر (یعنی ہارمون) کو دوران خون میں شامل کر دیتا ہے۔ یہ ہارمون تمام خلیوں کو یہ سگنل دیتا ہے کہ ATP کی پیداوار تیز کر دو۔ (ATP توانائی کی یونیورسل سورس ہے) اضافی توانائی سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں فراہم کر دی جاتی ہے اور آپ اپنے جسم میں رونما ہونے والے ان حیران کن واقعات سے لاعلم رہتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں میں اللہ کی ہی مدد (دی ہوئی قوت) سے اٹھتا بیٹھتا ہوں۔ اگر جسم کا یہ پراسرار پیچیدہ نظام ہمیں ضروری توانائی فراہم نہ کرے تو اٹھنا بیٹھنا تو کیا آپ نماز پڑھنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ آپ کا نماز پڑھ سکنا بھی آپ پر اللہ کا ایک احسان ہے جبکہ اکثر لوگ نماز پڑھ کر اللہ پر احسان جتاتے ہیں۔

نا جزوی حیات کا مقدر ہے۔ ہماری موت طبعی بھی ہوتی ہے اور غیر طبعی بھی۔ ہماری موت کا ایک بڑا سبب وائرس ہوتے ہیں۔ یہ ننھے سے طفیلی اجسام ہماری طرح اپنے اندر توانائی پیدا کرنے والے توانائی گھر (Mitocondria) نہیں رکھتے اس لئے اپنی پیداوار میں اضافہ نہیں کر سکتے۔ بعض نامعلوم وجوہات کی بناء پر ہماری بیرونی جھلی کے حفاظتی نظام میں کوئی خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کمی خرابی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک وائرس حفاظتی دیوار توڑ کر خلیے کے اندر داخل ہو جاتا ہے اور سب سے پہلے توانائی گھروں پر قبضہ کرتا ہے اور ان سے توانائی حاصل کر کے اپنی تعداد میں برق رفتاری سے اضافہ کر لیتا ہے۔ پھر وائرس کی یہ فوج وہاں سے نکل کر بیک وقت لاکھوں خلیوں پر حملہ آور ہو جاتی ہے اور ہر خلیے میں "دہشت گردی" کے لئے اسی آزمودہ طریقہ کار پر عمل کرتی ہے۔ اس طرح لاکھوں خلیے موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔

بیماری کے دوران ڈاکٹر صاحب آپ سے کہتے ہیں کہ یہ عام سا وائرل انفیکشن ہے اس بیچارے انفیکشن میں بھی آپ کے جسم کے اندر زندگی اور موت کی جنگ جاری رہتی ہے۔ کروڑوں خلیے مر رہے ہوتے ہیں اور جسم کا نئے خلیے تیار کرنے والا نظام اتنی ہی تیزی سے نئے اور تازہ دم خلیے پیدا کر رہا ہوتا ہے جس کا پراسرار دفاعی نظام اس جنگ میں بھرپور حصہ لیتا ہے جسم عام طور پر یہ جنگ جیت جاتا ہے اور وائرس کی قوت کو فنا کر دیا جاتا ہے۔ دشمن کی لاکھوں کروڑوں "لاشیں" ٹھکانے لگانے کا کام سفید خلیے انجام دیتے ہیں اور تیزی کے ساتھ "میدان جنگ" کو مردہ وائرس اور خلیوں سے صاف کرتے رہتے ہیں۔ بصورت دیگر تعفن کی وجہ سے پورے جسم میں زہر پھیل سکتا ہے۔ جسم کی دیکھ بھال' کنٹرول اور اسے قائم رکھنے والے پیچیدہ و پراسرار نظام بھی تیزی سے کام کرتے ہیں۔ بیماری کے حملے سے ہونے والے نقصانات کو جنگی بنیادوں پر پورا کیا جاتا ہے اور آپ جلد ہی دوبارہ ایک صحت مند بھرپور زندگی گزارنے لگتے ہیں۔

وائرل انفیکشن میں یہ جنگ جسم کے دفاعی نظام کو ہی لڑنا پڑتی ہے۔ کسی بھی قسم کے اینٹی بائیوٹک دوا کبھی وائرس پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔ اس کے باوجود صحت یابی کے لئے انسان کا شکریہ ڈاکٹروں اور حکیموں تک ہی محدود رہتا ہے۔ آپ کے جسم میں موجود اپنے رب کی عطا کردہ لاکھوں کروڑوں نعمتوں سے لاعلم بلکہ روز مرہ کے دنیاوی مسائل کی وجہ سے اکثر اپنے مہربان پروردگار سے خفا خفا رہتے ہیں ان کا شکریہ ادا کرنا تو بعد کی بات ہے!

باپ کی عمر کے ہیرو معاوضہ بھی مرضی کا

اداکارائیں "تمام جتن" آزمانے کے باوجود مرداداکاروں کے مقابلے میں کہیں کم معاوضے لے رہی ہیں

سداب خان

بالی وڈ فلم انڈسٹری میں ایک سے بڑھ کر ایک اداکار موجود ہیں جو اپنے تجربے اور مقام کے لحاظ سے فلم میں کام کرنے کا خطیر معاوضہ طلب کرتے ہیں۔ جن میں سلمان خان، شاہ رخ خان، عامر خان، اکشے کمار اور اجے دیوگن جیسے اداکار ایک فلم کے 30 سے 40 کروڑ روپے تک کا معاوضہ وصول کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ فلم کے منافع میں بھی ان اداکاروں کا حصہ ہوتا ہے جس سے انہیں اچھی خاصی رقم مل جاتی ہے گویا آج کے اداکار خاص طور سے سپر سٹارز کی چاندی ہی چاندی ہے۔

ان فلمی ستاروں کے معیار کا تعین انہیں ملنے والے معاوضوں سے کیا جاتا ہے۔ تاہم خواتین اداکاراؤں کا معاوضہ مرد اداکاروں کے مقابلے میں انتہائی کم ہوتا ہے ایک اندازے کے مطابق خواتین اداکاراؤں کو مرد اداکاروں کے معاوضے کا ایک چھوٹا سا حصہ ہی دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے انڈسٹری میں معاوضے کے لحاظ سے مالی عدم مساوات کا مظہر کر سامنے آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بالی وڈ کو مردوں کی انڈسٹری بھی کہا جانے لگا ہے جہاں ان کی مکمل اجارہ داری قائم ہے لہٰذا گنتی کی چند ایک مثالوں کے سوا زیادہ تر ٹاپ اداکارائیں دو سے تین کروڑ روپے کے اندر ہی معاوضہ پاتی ہیں۔

مالی عدم مساوات کے خلاف بالی وڈ کی چند چوٹی کی اداکارائیں جیسے دپیکا پڈوکون، کنگنا راناوت، کرینہ کپور اور ودیا بالن گاہے بگاہے آواز بلند کرتی رہتی ہیں جس کی وجہ سے ان با صلاحیت اداکاراؤں کے معاوضے میں کچھ حد تک اضافہ دیکھنے میں آیا ہے تاہم یہ ابھی بھی بہت کم ہے بالی وڈ کے صف اول کے اداکاروں کا اوسط معاوضہ چالیس کروڑ روپے بتایا جاتا ہے جبکہ ان کے مقابلے میں صف اول کی اداکاراؤں کو زیادہ سے زیادہ سات کروڑ کا معاوضہ ملتا ہے۔ اگر انڈسٹری سے مالی عدم مساوات کا خاتمہ کر دیا جائے تو دپیکا پڈوکون، ودیا بالن اور کنگنا راناوت جیسی اداکارائیں خاطر خواہ فوائد سمیٹ سکتی ہیں کیونکہ ان میں مردوں کی اس انڈسٹری میں اپنا الگ مقام بنانے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے تاہم انہیں مالی عدم مساوات کا مسئلہ درپیش ہے۔

یہاں ایک سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ مرد اداکاروں کے مقابلے میں خواتین اداکاراؤں کو کم معاوضہ کیوں دیا جاتا ہے؟ بالی وڈ میں خواتین تعصب کا شکار رہتی ہیں؟ جہاں تعصب کی بات ہے تو اس سے جزوی طور پر اتفاق کیا جا سکتا ہے تاہم اس مسئلے کو کریدنے اور اس کی گہرائی میں جھانکنے کی ضرورت ہے جب ہی مردوں کی بالادستی اور زیادہ معاوضہ وصول کرنے کی وجہ سامنے آ سکتی ہے۔ ذیل میں ان عناصر کا ذکر کیا جا رہا ہے جو مرد اور خواتین اداکاروں کے معاوضے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

1۔ درازعمری: ماضی کے مقابلے میں آج کل کے اداکاروں کو نوجوان اور بیٹیوں کی عمر کی اداکاراؤں کے ساتھ رومانس کرنا نسبتاً آسان ہو گیا ہے۔ ماضی کے مقبول اداکاروں دیو آنند، راجیش کھنہ اور امیتابھ بچن کو جوان سال اداکاراؤں کے ساتھ کام کرنے میں دقت کا سامنا کرنا پڑتا تھا لیکن دور جدید کے اداکاروں کی راہ میں اس طرح کے مسائل حائل نہیں ہوتے۔ اس کی وجہ آج کل کے اداکاروں کا فٹنس لیول اور کاسمیٹک سرجری کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ آج کل اداکار خود کو فٹ رکھنے کے لیے اپنی صحت اور فٹنس پر بھرپور توجہ دیتے ہیں جس کی وجہ سے وہ اپنے کیریئر کو وسعت دینے میں کافی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں خطروں کے کھلاڑی اکشے کمار کی مثال سب کے سامنے ہیں۔ انہوں نے گرتے سنورتے اپنے کیریئر کو سنبھالا دیا اور یہ پھر عروج پر پہنچ گئے۔ درازعمری اور طویل کیریئر نے ہی انہیں کئی نسلوں کا ہیرو بنائے رکھا ہے اور ان کے پرستاروں میں وقت کے ساتھ کافی حد تک اضافہ بھی ہوا ہے۔

2۔ مارکیٹنگ: بطور اداکاروں کی مارکیٹ میں بڑی اہمیت ہوتی ہے ایسے اداکاروں کو اپنی اس اہمیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے اور ڈائریکٹرز کو بھی ان کی مانگ کا علم ہوتا ہے مثال کے طور پر عامر خان کے لئے کوئی بھی ڈائریکٹر انتظار کرنے کو تیار ہے اور انہیں اپنی مرضی کا معاوضہ بھی پیش کرے گا کیونکہ لوگ عامر خان کو دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ گیا تری سعید نامی ایک ڈائریکٹر کے بقول عامر خان جیسے اداکاروں کی مارکیٹ میں اپنی الگ اہمیت ہے انہیں فلم کی کامیابی اور آمدنی کا زینہ سمجھا جاتا ہے اس لئے تمام ہدایت کار ایسے اداکاروں کو اپنی فلموں میں سائن کرنے کی تگ و دو میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے بقول رنبیر کپور اب تک اس مقام تک نہیں پہنچا لیکن بہت جلد وہ بھی اسی قطار میں کھڑے نظر آئیں گے اور پھر وہ بھی اپنی مرضی کا معاوضہ خود طے کرے گا۔ اس کے علاوہ گیا تری کا کہنا ہے کہ کوئی بھی ڈائریکٹر مکمل تجزیے اور جانچ پڑتال کے بعد ہی بڑے ناموں کو اپنی فلم میں شامل کرتے ہیں۔

3۔ سکرپٹ: بالی وڈ فلم انڈسٹری میں مردوں کو غلبہ حاصل ہے اور زیادہ تر فلموں کے سکرپٹس بھی ہیرو کو مد نظر رکھ کر لکھے جاتے ہیں تاہم حال ہی میں چند ایسی فلمیں بھی ریلیز ہوئیں جن میں مرد اداکار کی جگہ اداکارائیں مرکزی کردار میں جلوہ گر ہوئیں۔ جن میں کہانی، ڈرٹی پکچر اور کوئین، میری کوم اور فلم بالی وڈ شامل ہیں۔ یہ بہتر تبدیلی کی ایک لہر ہے تاہم اس پر مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔ بالی وڈ کو اگر خواتین کو آگے لانا ہے تو پھر ہیروئن اورینٹڈ فلموں کو انڈسٹری کا لازمی جز بنانا چاہئے۔ ڈائریکٹرز حضرات کو بھی مرد اداکاروں کی بجائے خواتین کو لیڈنگ کرداروں میں سائن کرنا ہوگا جب خواتین کو ان کا جائز حق اور مردوں جتنا معاوضہ مل سکتا ہے بصورت دیگر خواتین اداکارائیں مالی عدم مساوات کا ہی شکار رہے گی۔

گیا تری سعید کے بقول ہیما مالنی اپنے دور میں سب سے زیادہ معاوضہ وصول کرنے والی اداکارہ تھیں وہ ہمیشہ اپنے دور کے مرد اداکاروں کے برابر معاوضے کا مطالبہ کرتی تھیں۔ تاہم موجودہ دور میں کترینہ فلم انڈسٹری کی صف اول کی اداکارہ مانا شری بھی فلم میں کام کرنے کی کافی معاوضہ لیتی ہیں اس بارے سانتا انڈین فلم انڈسٹری کے ایک ابھرتے ہوئے اداکار موہنش گجرال کا کہنا ہے کہ مانا شری اب بھی مرد اداکاروں کے برابر معاوضے کا مطالبہ کرتی ہیں جبکہ پروڈیوسرز حضرات تک اپنے نئے پراجیکٹ کا اعلان نہیں کرتے جب تک مانا شری سے معاملات طے نہیں ہو جاتے ان کے بقول مانا شری نام کسی بھی فلم کی کامیابی سمجھا جاتا ہے کیونکہ انہیں انڈسٹری میں 25 سال کا تجربہ ہے یہی وجہ ہے کہ وہ ہر طرف چھائی ہوئی ہوتی ہیں اور کوئی ان کی مرضی کے بغیر معاوضہ طے نہیں کر سکتا جبکہ بالی وڈ میں یہ مقام دیگر اداکاراؤں کی بہ نسبت ودیا بالن کو حاصل ہے کیونکہ شادی شدہ اور بڑھتے ہوئے وزن کے ہوتے ہوئے بھی انہوں نے ڈرٹی پکچر اور کہانی جیسی فلموں میں کمال اداکاری سے نہ صرف ناظرین اور پرستاروں بلکہ نقاد حضرات کو بھی اپنی تعریف کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنا معاوضہ بڑھا دیا ہے۔ اس طرح ان کی دوسری ہم عصر اداکارائیں بھی پہلے کے مقابلے میں اس وقت دگنا سے بھی زیادہ معاوضہ وصول کر رہی ہیں مختصراً یہ کہ مضبوط اور جاندار کرداروں کی بدولت ہی اداکاراؤں کے معاوضے میں اضافہ ممکن ہے حال ہی میں میڈیا سے بات کرتے ہوئے بالی وڈ پر راج کرنے والی اداکارہ دپیکا پڈوکون نے معاوضے میں مالی عدم مساوات کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ مرد اور خواتین اداکاروں کے معاوضے میں زمین آسمان کا فرق ہے مردوں کے مقابلے میں خواتین کا معاوضہ بہت کم اور معمولی ہوتا ہے تاہم اگر آپ پچھلے ایک دو سال کا تجزیہ کریں تو اس عرصے میں خواتین کے معاوضوں میں خاطر خواہ اضافہ دیکھنے میں آیا ہے اور انہوں نے پہلے کی نسبت بہت کچھ پالیا ہے جو اس سے پہلے ان کے لئے شاید ناممکن تھا۔ تاہم ہمیں مزید بہتری کی امید اور جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے۔

کرکٹ بائی چانس

بلال حسین

اجمل کی بدقسمتی

مشکوک ایکشن کی وجہ سے پاکستانی آف سپنر سعید اجمل ٹی ٹونٹی رینکنگ میں تو ٹاپ پوزیشن پر رہے جبکہ ون ڈے کرکٹ میں بھی وہ بلے بازوں کو ہراساں کرنے میں خاصے کامیاب رہتے ہیں تاہم حیران کن بات یہ ہے پاکستانی ٹیم کی جیت میں اہم کردار ادا کرنے والے سعید اجمل نے ون ڈے کرکٹ میں کوئی بھی مین آف دی میچ کا ایوارڈ حاصل نہیں کیا۔ پاکستان کیلئے بار ہا بہت ہی دوران وہ وکٹیں لینے میں بھی کامیاب ہوئے ہیں لیکن انکے باوجود جب مین آف دی میچ ایوارڈ کی باری آتی ہے تو ایوارڈ کوئی اور لے اڑتا ہے اب اسے اجمل کی بدقسمتی کہئے یا کچھ اور......

جب نظر لگ جاتی ہے

بھارت میں جاری آئی پی ایل ہو یا سری لنکن سرزمین پر ون ڈے سیریز، بھارتی کرکٹ ٹیم کے کپتان مہندرا سنگھ دھونی اور سریش رائنا سکور کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ آئی پی ایل میں بھی دونوں کھلاڑی ایک ہی کلب کیلئے ٹیم چنائے سپر کنگز کی طرف سے کھیلتے ہیں جہاں وہ چوکوں اور چھکوں کی بارش کے ساتھ سنچریاں بھی جڑ رہے ہیں تاہم جب یہ دونوں بلے باز ایشیا سے باہر کھیلتے ہیں تو ان کی فارم کو نظر لگ جاتی ہے جہاں آج تک دونوں بلے باز سنچری بنانے میں ناکام رہے ہیں۔

حسن اتفاق سے

سابق انگلش کپتان ایلک سٹیورٹ کا نام کون نہیں جانتا، وہ انگلینڈ کرکٹ ٹیم میں وکٹ کیپر بلے باز رہ چکے ہیں۔ دائیں ہاتھ سے بیٹنگ کرنے والے بلے باز نے اپنے ٹیسٹ کرکٹ کیریئر میں 8463 رنز بنائے ہیں، انکا کیریئر سکور تو آپکو حیران نہیں کر پائیگا لیکن یہ بات سن کر آپ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ ان کی تاریخ پیدائش اور انکا ٹیسٹ کرکٹ میں ہائی سکور ایک جیسا ہے۔ یعنی انکی تاریخ پیدائش 63-4-8 (آٹھ اپریل 1963) ہے جبکہ انکے ٹیسٹ کرکٹ میں رنز بھی 8463 ہیں۔

ریکارڈ توڑ کے دکھاؤ

کرکٹ کی بات کی جائے اور آسٹریلین کھلاڑی سرڈونلڈ بریڈمین کے نام نہ آئے تو کرکٹ کی تاریخ ادھوری رہتی ہے۔ بریڈ مین کا ٹیسٹ کرکٹ میں رنز اوسط 99.94 ہے آج تک کوئی بھی بلے باز یہ اعزاز حاصل نہیں کر سکا تاہم حیران کن بات یہ ہے کہ 52 ٹیسٹ میچز اور 234 فرسٹ کلاس کرکٹ کھیلنے والے اس عظیم بلے باز نے اپنے کیریئر میں صرف 6 چھکے لگائے۔ موجودہ کرکٹ میں جارح مزاج بلے بازوں کو زیادہ پذیرائی ملتی ہے تاہم بریڈ مین صرف 6 چھکے لگانے کے باوجود ٹیسٹ کرکٹ میں ایسا ریکارڈ بنا گئے جو آج تک کوئی بھی نہ توڑ سکا۔

عمران پیچھے آفریدی آگے

پاکستان کی کرکٹ تاریخ میں عمران خان کو جو شہرت حاصل ہے وہ شاید ہی کسی کرکٹر کو نصیب ہوئی انہوں نے نہ صرف باؤلنگ میں اپنے جوہر دکھائے بلکہ بیٹنگ میں بھی انہوں نے پاکستان کی جیت میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے ون ڈے کرکٹ میں 182 وکٹیں حاصل کر رکھی ہیں جبکہ ون ڈے کیریئر میں انہوں نے 72.65 کے سٹرائیک ریٹ سے 3709 رنز بنا رکھے ہیں۔ دوسری طرف یہ بات توجہ طلب ہے کہ بوم بوم کے نام سے شہرت پانے والے شاہد خان آفریدی نے ون ڈے کیریئر میں عمران خان سے زیادہ وکٹیں حاصل کر رکھی ہیں یہی نہیں بلکہ بیٹنگ میں بھی وہ عمران خان سے بازی لے گئے ہیں۔ انہوں نے ون ڈے کیریئر میں اب تک 115.7 سٹرائیک ریٹ کے ساتھ 7753 رنز بنائے ہیں۔

بھارتی کرکٹ ٹیم کے سابق کپتان جگن ناتھ ڈالمیا پنی بیٹنگ کی وجہ سے پوری دنیا میں مشہور ہیں جن کو اپنی تکنیک پر مکمل عبور حاصل ہے۔ ٹیسٹ میچز میں انہوں نے کئی ریکارڈز اپنے نام کئے ہیں ٹیسٹ کرکٹ میں انکا زیادہ سے زیادہ سکور 248 ناٹ آؤٹ ہے تاہم حیران کن بات یہ ہے کہ پاکستانی آل راؤنڈر وسیم اکرم کا ٹیسٹ کرکٹ میں سب سے زیادہ سکور 257 ہے جو کہ ٹنڈولکر جیسے بلے باز کے ہائی سکور سے بھی زیادہ ہے۔

174 گیندوں پر 36 رنز

سنیل گواسکر کا نام نہ لیا جائے تو بھارتی کرکٹ کی تاریخ ادھوری رہ جاتی ہے۔ مخالف ٹیمیں کیلئے سنیل گواسکر کو بھارتی بیٹنگ لائن میں سب سے زیادہ مضبوط حریف سمجھا جاتا تھا کیونکہ انکے ہوتے ہوئے انگلیز کیلئے کامیابی موجود رہتا تھا تاہم ایک ایسا ریکارڈ بھی انکے نام ہے جس کے متعلق جان کر آپ ششدر رہ جائیں گے۔ 60 اوورز پر مبنی 1975 ورلڈ کپ میں انگلینڈ نے بھارت کو جیتنے کیلئے 335 رنز کا ہدف دیا۔ سنیل گواسکر اوپننگ کیلئے آئے تو 60 اوورز کی مکمل بھارتی اننگ میں وہ ناٹ آؤٹ رہے لیکن بھارت یہ میچ جیتنے میں ناکام رہا۔ بھارت نے اوورز تو مکمل کیلئے لیکن اس نے ان تمام اوورز میں 3 وکٹوں کے نقصان پر صرف 174 رنز بنائے۔ سنیل گواسکر 174 گیندیں کھیل کر صرف 36 رنز بنا کر یہ بدترین ریکارڈ اپنے نام کر گئے۔ یہ میچ بھارت نے بنا کوشش کئے ہی انگلینڈ کی جھولی میں ڈال دیا۔

ہر نمبر پر نمبرون

ٹیم لائن اپ میں اگر کسی کھلاڑی کو انکی پوزیشن پر نہ کھلایا جائے تو وہ پرفارم نہ کیا تو ٹیم میں کھیلنے ہی چھوڑ دیتے ہیں اور بعد میں جب آگے پرفارمنس کے حوالے سے سوال پوچھا جاتا ہے تو یہ بات کہہ کر وہ جان چھڑا لیتے ہیں کہ ہمیں اپنی پوزیشن پر نہیں کھلایا جاتا تاہم کچھ ایسے کھلاڑی بھی گزرے ہیں جن کو اوپننگ سے لیکر دسویں نمبر کے درمیان کسی بھی پوزیشن پر کھلایا جاتا تو وہ نہ صرف جرات تیار رہتے تھے بلکہ ٹیم کیلئے انہوں نے پرفارمنس بھی دکھائی۔ ان کھلاڑیوں میں جنوبی افریقہ کے لانس کلوزنر، پاکستان کے عبدالرزاق، شعیب ملک اور سری لنکا کے دلشان جنگر ہے کا نام شامل ہے۔

سچن سے آگے وسیم اکرم